
نمل
قسط نمبر 24
ٹوٹے تارے جیسا دل

Join Us on Facebook

Get Notificatons of Newly Uploaded Books

Find us on: facebook®

Follow below Image to Get Notifications of Newly Uploaded Books



نمل

(نمرہ احمد)

قسط نمبر: 24

"ٹوٹے تارے جیسا دل"

میں نے دیا تمہیں سورج!
مگر چاہا تم نے چاند!
جب چاند دیا تم کو
تم نے مانگے ستارے
تو میں اندھا دھند پہنچی
لامحدود ستاروں کی کہکشاں میں
اور خود کو لپیٹا
ہر اک ستارے کے گرد
صرف تمہارے لیے
ستارے، چاند اور سورج باہم بھی
تمہارے متلون دل کے لیے کافی نہ ہو پائے
سو میں نے اٹھائے اپنے آنسو
اور تمہیں بنا دیا ایک سمندر
تا کہ تم زمین پہ بادگیری کرتے چلو
اور اس ناممکن خزانے کو کھوج نکالو
جس کی تمہیں مستقل تلاش ہے
[illegible]
میرا سورج تم کو بیدار کرنے کے لیے موجود ہوگا

ہر رات میرا چاند حاضر ہوگا

تمہاری تشفی کے لیے

اور اگر کبھی تمہیں ہو میری طلب

تو دیکھنا ستاروں کے درمیان

ہر ایک تارے کے گرد لپٹی

میں وہیں ٹھہری ہوئی ملوں گی ا

Mirtha Michelle Castro Marmol

صبح دھیرے دھیرے فوڈلی ایور آفٹر کے گرد دھند لکھتا نے جا رہی تھی۔ ٹھنڈا ہوا ناشتہ یونہی ڈھکا رکھا تھا اور زمر یوسف بازو میز پہ بچھائے سر ان پہ ٹکائے سو رہی تھی۔ دروازے کا لاک کھلنے کی آواز آئی تو اس کی آنکھ کھلی۔ پھر وہ تیزی سے سیدھی ہوئی اور نیند سے بھری آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ بیرونی دروازہ کھول کر جنید اندر داخل ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ رکا۔ آنکھوں میں حیرت در آئی۔

''آپ؟ اس وقت؟'' اس نے گھڑی کی بجائے مڑ کر آسمان کے رنگ کو دیکھا۔ وہ بال کانوں کے پیچھے اڑستی ابھی ابھی ہی اپنا سیل فون اٹھا کر دیکھنے لگی تھی۔ ''فارس نظر آیا نہیں جنید؟''

''نہیں تو۔ مگر آپ کیسے آئیں؟ باہر تو کوئی کار نہیں کھڑی۔''

زمر چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ ''فارس کہاں گیا؟ کار بھی لے گیا؟'' وہ اسے کال ملانے لگی۔ گھنٹیاں جا کر پلٹ آئیں مگر جواب نہ ملا۔ جنید ناشتے کے برتن نظر انداز کرتا کچن کی طرف بڑھ گیا۔ (کچن میں رات کے معرکے کے نشانات وہ حتی المقدور صاف کر چکی تھی)

فارس کا پیغام چند لمحوں بعد موصول ہوا۔ ''ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تم گھر چلی جانا۔''

زمر کے ابرو تن گئے۔ آنکھوں میں دبا دبا سا غصہ ابھر آیا۔ اس نے پرس اٹھایا، موبائل اندر پھینکا اور باہر نکل آئی۔

''کیب سے جاؤں گی کیا اب؟ اتنا بھی خیال نہیں آیا اسے۔'' اس کا سارا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کتنے عاجز ہیں ہم کہ پاتے ہیں

بندے بندے میں بو خدائی کی

صبح کی دودھیا روشنی میں سورج کی سنہری تاریں ملیں تو آسمان مزید روشن ہوگیا۔ ایسے میں اس بلند عمارت کی بالائی ترین منزل کے کارز آفس میں ہاشم اپنی پاور چیئر پہ موجود تھا۔ گرے سوٹ اور ٹائی میں ملبوس بال جیل سے پیچھے کو جمائے آنکھوں پہ عینک لگائے وہ [illegible] کاغذ پڑھ رہا تھا۔ سامنے [illegible] کندھوں کے ساتھ [illegible] سے بغور دیکھ رہا تھا۔

ہاشم نے دفعتاً عینک اتاری اور چہرہ اٹھاتے ہوئے کاغذ میز پہ ڈالے۔

"بے کار ہے یہ سب۔ اس میں کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ حسین نے اوسی پی کو بلیک میل کیا تھا۔"

"لیکن اس سے یہ ثابت ضرور ہوتا ہے کہ اس نے اوسی پی کی بیٹی کی ویڈیو تباہ کرنے کے عوض کوئی تحفہ وصول کیا تھا' وہ ان میلز میں حمیرا کو یہی بتا رہی ہے' مگر ظاہر ہے حمیرا یہ نہیں سمجھ سکی کہ یہ تحفہ لیک شدہ پیپرز تھے۔" احمر بے چینی سے بولا۔

"میں مانتا ہوں ایسا ہی ہوا ہوگا' لیکن کوئی ثبوت نہیں ہے اس بات کا۔" ہاشم نے کندھے اچکائے تھے۔ احمر گہری سانس لے کر کھڑا ہوا۔ "پھر میں نئی نوکری تلاش کرنا شروع کر دیتا ہوں سر۔ شکریہ آپ نے میری بات سنی۔" وہ واپس مڑا اور چند قدم دور گیا جب ہاشم نے پکارا۔

"تم اپنے آفس میں واپس آ چکے ہو۔ میں بات کر کے مکر نہیں جاتا۔ میں اس کو دوسرے طریقے سے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔" وہ اب فون اٹھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ احمر نے مڑ کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔

"شکریہ سر۔" وہ باہر نکلا اور دروازہ بند کر کے مکا فضا میں لہرایا "یس!" اور آگے بڑھ گیا۔ حلیمہ نے بے اختیار اسے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ اندر ہاشم فون کان سے لگائے میز پہ رکھی اپنی ڈاک کھول رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ ناخوشی سے انگریزی میں تیز تیز بولتا جا رہا تھا۔

"کون سا کیس؟ کوئی کیس [illegible] کر دوں گا ان کو یونہی۔"

ڈاک الگ الگ کرتے ہوئے اس نے چند لفافوں کو بنا کھولے ردی کی ٹوکری میں اچھال دیا' اور کچھ کو علیحدہ رکھ دیا۔ اور یہ تبھی تھا جب اس نے وہ لفافہ دیکھا۔ بات کرتے ہوئے اس کے ابرو بھنچے۔

وہ پرانے کاغذ کا پیلا زرد سا لفافہ تھا۔ دیکھنے سے بھاری معلوم ہوتا تھا۔ اس نے تعجب سے موبائل رکھتے ہوئے اسے اٹھایا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر پیپر نائف کے ساتھ لفافہ چاک کیا۔ اندر کوئی دبیز شے تھی۔ ہاشم نے انگلی سے کھینچ کر اسے باہر نکالا۔

وہ ایک سبز پاسپورٹ تھا۔ فرنٹ کور اور چند صفحات۔ اس نے پہلا صفحہ پلٹایا اور ... ایک دم وہ سیدھا ہو کر بیٹھا۔ پاسپورٹ ہولڈر کی تصویر سامنے تھی۔ بڑھی شیو والا سعدی یوسف۔ لیکن .... پاسپورٹ ادھورا تھا۔ اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر لفافے میں جھانکا۔ اندر ایک اور پرانے طرز کا کاغذ تہہ کیا رکھا تھا۔ ہاشم نے اسے نکالا۔ اس پہ انگریزی میں گویا قلم دوات سے چند الفاظ تحریر تھے۔

"سعدی یوسف کو عدالت میں دہشت گرد ثابت کرنے کے لئے یہ پاسپورٹ کافی ہے۔ لیکن اس کا مکمل ہونا ضروری ہے۔ اس نے یہ ٹریش کین میں اچھال دیا تھا۔ میں نے اس کے سارے ٹکڑے جمع کر لیے ہیں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں اسے تمہیں مکمل کر کے دوں تو اپنے ٹویٹر اکاؤنٹ سے یہ نمبر لکھ کر ٹویٹ کر دو۔ میں سمجھ جاؤں گا۔"

فقط

نیچے ایک نمبر درج تھا۔ ریاضی کے چند سے سروبا بند ہے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس لفافے سمیت تمام اشیاء کو دراز میں ڈال دیا۔

اسی پل اس کا فون بجا۔ بلاکڈ نمبر کالنگ۔ اس نے موبائل کان سے لگاتے ہوئے احتیاطاً ہیلو کہا۔

''سر..... کیا آپ میری بات سن سکتے ہیں؟'' وہ خاور تھا۔ ہاشم نے ایک نظر بند دراز کو دیکھا اور پھر گہری سانس لی۔

''میں نے سعدی یوسف کی جان بچائی تھی' خاور۔ میرے اس کے ساتھ بہت سے اختلاف تھے' اور اپنی اس ویڈیو کے بعد میں اس سے نفرت کرنے لگا ہوں لیکن ایک محب وطن لڑکے کو دہشت گرد قرار دے دینا..... یہ ظلم میں نہیں کرنا چاہتا۔ کسی کو مارنا الگ بات ہے۔ جیتے جی مارنا بالکل الگ۔ اور مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ کیس کبھی عدالت میں نہیں چلے گا۔ اس لیے مجھے اس پاسپورٹ کی ضرورت نہیں ہے جو تم رشوت کے طور پہ بھیج رہے ہو مجھے۔''

''سوری سر؟ کون سا پاسپورٹ؟'' وہ اپنی جگہ الجھ گیا تھا۔ ''میں نے آپ کو کچھ نہیں بھیجا سر۔'' پھر روانی سے بولا۔ ''اگر آپ مجھے اپنے بندوں سے تلاش کروانے کی بجائے میری بات سن لیں تو میں آپ کے والد کے قتل کا معمہ حل کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن اس کے لیے آپ کو مجھ پہ اعتبار کرنا ہوگا۔'' پھر وہ ٹھہر کر بولا۔ ''آپ کے لئے میں نے اپنی زندگی کے اتنے سال لگا دیے' مگر آپ نے مجھ سے ایک دفعہ بھی نہیں پوچھا کہ میں بے گناہ تو نہیں ہوں؟ کیا میرا اتنا بھی حق نہ تھا' سر! ایک دفعہ تو پوچھا ہوتا سر کہ میرے باپ کا قاتل کون ہے' پھر میں پاتال سے بھی اس کو کھینچ کر لے آتا مگر آپ اس لڑکے کی باتوں میں آ گئے۔''

''سنو خاور! جلد یا بدیر میرے آدمی تمہیں ڈھونڈ لیں گے۔ اس لیے اب دوبارہ فون نہ کرنا۔'' ناگواری سے کہتے اس نے فون رکھ کر لیپ ٹاپ کھولا۔ البتہ دماغ کی ایک ہی مسلسل جلنے بجھنے لگی تھی۔ اگر خاور نہیں تھا تو یہ کون سا تیسرا فریق تھا جو میدان میں کود پڑا تھا؟

چند منٹ ہی وہ کام کر پایا اور پھر ایک دم سے اس نے فون اٹھایا اور ایک نمبر ملا کر اسے کان سے لگایا۔ ماتھے پہ بل ڈالے وہ گھنٹی سنتا رہا۔

''تم نے کہا تھا تم اس آخری چیز کی قیمت لگاؤ گی' کیا وہ یہ پاسپورٹ ہے جو تم نے مجھے بھیجا ہے؟''

''کون سا پاسپورٹ؟'' شہلیشا نے حیرت سے دہرایا تھا۔

''اداکاری مت کرو۔'' وہ اکتا کر کہہ رہا تھا جب.....

''تمہارا ایک میموری کارڈ تھا میرے پاس۔'' ہاشم ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔

''تمہارے باپ کا کمپیوٹر ہیک کیا تھا میں نے' یاد ہے؟ وہیں سے کچھ ملا تھا مجھے۔ مگر وہ معلومات ایسی تھیں کہ میں ان کو استعمال نہیں کر سکتی تھی۔ سوچا کسی اور کو دے دوں ورنہ تم تو میری جان لے لو گے۔ خیر اب وہ سب میرے لیے بے کار ہے اور وہ تمہیں بھی نہیں اب ملے گا۔ رہی میں..... تو میں ملک چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے تمہاری زندگیوں سے جا رہی ہوں۔''

ہاشم فون بند کر کے سوچتا رہا۔ اگر وہ سچ کہہ رہی تھی تو بھی اورنگزیب کے کمپیوٹر میں کم از کم وارث غازی کی فائلز تو تھیں نہیں سو وہ اس کے ہاتھ نہیں لگی ہوں گی۔ [illegible] سر جھٹک کر وہ دوبارہ کام کرنے لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اس بار وہ ٹھنی ہے روٹھے بھی نہیں ہم

اب کہ وہ لڑائی ہے کہ جھگڑا نہ کریں گے ہم

ہسپتال کی چمکتے فرش والی راہداری' خاموش اور سرد پڑی تھی۔ فارس نے کمرے کے دروازے پہ انگلی کی پشت سے دستک دی' پھر دروازہ دھکیلا تو اندر کا منظر کھلتا چلا گیا۔

بیڈ پہ لحاف تانے آبدار ٹیک لگائے بیٹھی تھی' اور ایک نرس اس کے پیچھے تکیے برابر کر رہی تھی۔ اس کے سرخ بال پونی میں بندھے تھے اور چہرے پہ مردنی چھائی تھی۔ کلائیاں سخت پٹیوں میں بندھی تھیں اور وہ برے موڈ کے ساتھ نرس سے نقاہت سے کچھ کہہ رہی تھی جب آہٹ سنی تو چہرہ پھیرا۔

اسے چوکھٹ میں کھڑے دیکھ کر نگاہوں میں تحیر در آیا۔ سانس بھی تھم گیا۔ پھر سر کے خم سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

وہ سلام کہتا اندر داخل ہوا۔ کمرہ کافی وسیع وعریض اور پرتعیش تھا۔ وہ کھڑکی کے قریب رکھے شاہانہ طرز کے کاؤچ پہ بیٹھ گیا اور ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا لی۔ پھر لبوں پہ بند مٹھی رکھے' خاموشی سے آبدار کو دیکھنے لگا۔ آبی نے نظریں جھکا لی تھیں۔ نرس باہر نکلی تو وہ ہلکے سے کھنکھارا۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

آبدار نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا' پھر نقاہت سے مسکرائی۔ "اب ٹھیک ہوں۔" ذرا رکی۔ "بابا سے ملاقات ہوئی آپ کی؟"

"میری شکل پہ گدھا لکھا ہے کیا جوان کے ہوتے ہوئے ادھر آتا؟ وہ نکلے ہیں تو آیا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ انداز میں کاٹ سی تھی۔ وہ چپ ہوگئی۔ نظریں جھکا لیں۔

"کیوں کیا آپ نے ایسا؟" اب کے وہ نرمی سے بولا تو وہ اپنے پٹیوں میں بندھے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

"مجھے اور کچھ سمجھ نہیں آیا۔ آپ میری کال نہیں اٹھا رہے تھے۔"

"تو اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو اٹھا لیتا آپ کی کال؟ ایسے کون کرتا ہے؟ اپنے والد کا تو سوچنا تھا۔" آبدار نے بھیگی آنکھیں اٹھائیں۔

وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور اس کے آنسو گالوں پہ لڑھک رہے تھے۔ "میں نے آپ کو اتنی کالز کیں' آپ کیوں نہیں آئے؟"

"میں مصروف تھا۔"

"کس کے ساتھ؟" اس نے آنکھیں اٹھا کر تیزی سے پوچھا تو وہ اتنی ہی تیزی سے بولا۔

"آپ کو حق ہے یہ پوچھنے کا؟"

آبدار کی اس پہ بھی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے۔ "آپ چلے جائیں۔" اور وہ پیچھے سے اپنے تکیے جوڑنے لگی تو وہ اسے

جاتے [illegible]

"آبدار!" وہ کہتے ہوئے اٹھا مگر دروازے کی طرف جانے کی بجائے اس کی جانب قدم بڑھائے۔ "آپ کو اپنا خیال رکھنا چاہیے تھا۔" اس کی آواز میں نرمی تھی۔ وہ تکیے جوڑتی رک گئی۔ چہرہ اٹھا کر بلی جیسی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی جو ابھی تک بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ اس کے قریب آ رکا تو وہ بیٹھے بیٹھے ذرا پرے ہوئی۔ وہ آہستہ سے اس کے بازو کے قریب بیڈ پہ بیٹھا۔

"اگر آپ کو مجھے بلانا تھا تو اس کے دوسرے طریقے بھی تھے۔ یہ سب کر کے آپ نے مجھے تکلیف دی ہے۔" وہ اسے فکرمندی سے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا اور آبی کی بھیگی آنکھیں بے خودی کے عالم میں اس پہ جمی تھیں۔

"مجھے افسوس ہے اگر میری وجہ سے آبدار آپ کو کبھی کوئی غلط تاثر ملا مگر میری نیت ہمیشہ صاف رہی۔ میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔" وہ اس پہ نظریں جمائے دکھ سے کہہ رہا تھا۔ "کیونکہ میں نے اپنی ساری زندگی بہت احتیاط سے گزاری ہے۔ جس کے اوپر دل ہارا اس کے نام کو بھی اپنے نام کے ساتھ آلودہ ہونے نہیں دیا اس لیے کوئی آپ کے نام کے ساتھ میرا نام جوڑے مجھے اس بات نے بہت پریشان کیا ہے۔ اسی لیے ادھر آیا ہوں۔" وہ نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ آبی کے لب مسکراہٹ میں ڈھلتے گئے۔ آنکھیں ہنوز ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

"آپ کو میری فکر تھی؟"

"ظاہر ہے مجھے فکر تھی!" اسی نرمی سے کہتے ہوئے فارس نے ہاتھ بڑھایا اور اس کا پٹیوں میں لپٹا ہاتھ تھاما۔ آبدار کا سانس رک گیا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ "اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ دوبارہ کبھی ایسی حرکت نہ کریں۔" اس کی آنکھیں آبی کی آنکھوں پہ جمی تھیں اور دونوں ہاتھوں میں اس کی بائیں کلائی تھام رکھی تھی۔

"پہلے آپ وعدہ کریں کہ میرے بلانے پہ آ جایا کریں گے۔"

فارس نے گہری سانس لی۔ "میں ....وعدہ کروں؟ میں مس عبید ایک شادی شدہ آدمی ہوں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ایک شادی شدہ آدمی کو کیسے ڈیل کیا جاتا ہے؟"

"کیسے؟" وہ چیلنجنگ انداز میں مسکرائی۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ چند پل۔ چند ساعتیں۔ بنا پلک جھپکے۔ اور پھر ایک دم فارس کی انگلیوں نے اس کی کلائی کی پٹی کو جھٹکا دیا۔ آبدار کی کراہ نکلی مگر اس سے پہلے کہ وہ ہکا بکا سی اپنا ہاتھ چھڑاتی' وہ درشتی سے ایک ہاتھ سے اس کی کلائی تھامے' دوسرے سے اس پہ لپٹی پٹی کھینچ کر اتارتا رہا تھا۔

"چھوڑیں۔ کیا کر رہے ہیں؟" وہ چلائی مگر فارس نے پٹی کی آخری تہہ نوچ کر پرے پھینکی اور اس کی کلائی اٹھائی۔ وہ بے داغ تھی۔ خراش تک نہ تھی۔

"جس طرح آپ کے والد صاحب نے مجھ سے بات کی' مجھے بہت برا لگا۔ وہ ہوتے کون ہیں مجھے قصوروار ٹھہرانے والے۔" اس کی [illegible]

ہیں۔ وہاں ایسے ایسے لوگ ہوتے تھے جن کی شکل دیکھ کر بھی آپ کی جان نکل جائے گی' میں نے ان کے ساتھ مروا دیا ہے۔ آپ کے یہ بے کار ڈرامے سروائیو نہیں کروں گا کیا؟'' اس کی کلائی کو زور کا جھٹکا دے کر چھوڑا۔ وہ شل سی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ سرخ پڑتی آنکھیں اس پہ جمائے انگلی اٹھا کر بولا۔ ''آئندہ اگر آپ نے مجھے کال کی' یا میرے نام کے ساتھ اپنا نام جوڑنا چاہا' یا میرے گھر اور ریسٹورانٹ کا رخ بھی کیا تو میں کس حد تک جا سکتا ہوں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ بات آئی ہے دماغ میں یا نہیں؟'' غصے سے بولتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آپی نے شل نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''تو آپ یہاں صرف اپنا نام صاف کرنے آئے تھے۔''

''جی ہاں۔ کیونکہ جب میں نے آپ کو بھی کوئی غلط تاثر نہیں دیا تو آپ کی ان جذباتی حرکتوں کے لئے مجھے ذمہ دار نہ ہی ٹھہرائیں آپ کے والد صاحب تو اچھا ہے۔ میں ان کے باپ کا ملازم نہیں ہوں جو ان کی باتیں سنوں گا۔ اس لیے ان سے کہیے گا میرے منہ نہ لگیں آئندہ ' ابھی سے بولتا ایک قہر آلود نظر اس پہ ڈالتا' اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

فارس دروازے تک پہنچا تھا جب اسے آواز آئی۔ اس نے چونک کر مڑ کر دیکھا۔ وہ اپنی دوسری کلائی کی پٹیاں نوچ نوچ کر اتار رہی تھی۔ فارس کے ابرو اکٹھے ہوئے مگر اس سے پہلے کہ وہ اسے روک پاتا' وہ کلائی برہنہ کر چکی تھی۔

''یہ ہے وہ جو میں نے کاٹی تھی۔'' قہر آمیز نظروں سے اسے دیکھتی وہ بولی تھی۔ فارس نے بے اختیار اس کی پہلی کلائی کو دیکھا جو سوائے ذرا سی کھروچ کے صاف تھی البتہ یہ والی کلائی.... یہ بری طرح زخمی دکھائی دیتی تھی۔ لمحے بھر کو وہ کچھ بول نہیں سکا۔

''وہ.... تمہارے لیے.... فارس غازی.... ایسا.... کبھی نہیں کرے گی۔''

فارس نے بڑی مشکل سے قدم اٹھائے تھے۔ وہ کچھ کہے بغیر تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ اب ہذیانی انداز میں خود سے لگی سوئیاں اور نالیاں نوچ نوچ کر پھینکنے لگی تھی۔ اس کے برف ہوئے آنسو اب روانی سے گرنے لگے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سوا درد میں تنہا کھڑا ہوں

پلٹ جاؤں مگر موسم نہیں ہے

سورج کی نرم گرم روشنی مورچال کو اس دھند آلود صبح میں بھی دہکا رہی تھی۔ زمر واپس آ کر اندر جانے کی بجائے لان میں گھاس پہ رکھے جھولے پہ آ بیٹھی تھی۔ ٹھنڈی ہوا اس کے گھنگریالے بال اڑا رہی تھی مگر وہ بے نیازی سی اسی طرح بیٹھی' آنکھیں موندے جھولا لیتی رہی۔ جوتے اور پرس گھاس پہ ہی ادھر ادھر لڑھکے پڑے تھے۔

بالائی منزل کی کھڑکی سے اندر جھانکو تو حنین لیپ ٹاپ کے آگے جڑی بیٹھی تھی۔ دلچسپی سے وہ اسکرین پہ لکھی عبارتیں پڑھ رہی تھی

نچلی منزل کا منظر کسی عام صبح سے مختلف لگتا تھا۔ ندرت اور حسینہ کچن میں تھیں۔ ناشتے کی مہک' پراٹھوں کی خوشبو' برتنوں کی اٹھا پٹخ۔ ندرت بہن بہت جوش سے اہتمام کرنے میں لگی تھیں۔ لاؤنج میں بیٹھے ابا بھی صداقت کو ڈپٹ ڈپٹ کر ایک ایک کونا صاف کرنے کو کہہ رہے تھے۔ جانتے تھے سعدی زمر کی طرح کتنا نفاست پسند تھا۔ حسینہ کو خوب تاؤ چڑھ رہے تھے۔ (نرا ڈرامہ ہے سارا خاندان۔ ناں میں پوچھتی ہوں اس زخم والے منہ لئے' سوکھے سڑے لڑکے میں رکھا کیا ہے جو سب اس کے لئے پاگل ہو رہے ہیں۔ سیدھے منہ سلام تو اس نے مجھے کیا نہیں۔ اب تہوں والے پراٹھے بناؤ اس کے لئے۔) وہ رات سے پھرکی کی طرح گھوم رہی تھی اور اب دل چاہ رہا تھا۔ اس پراٹھے میں زہر ملا دے۔ بیلن کو آٹے پہ برابر کرتے بڑبڑاتے ہوئے اس نے سر اٹھایا تو چونکی۔

سعدی کندھے پہ بیگ لئے' چہرہ جھکائے کچن کے باہر کھلتے دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ ندرت ابھی ابھی لاؤنج میں گئی تھیں۔ (سعدی دوسری جانب سے آیا تھا) سو کسی نے اسے آتے نہیں دیکھا۔ حسینہ چند لمحے تو کھڑی رہی' پھر بیلن رکھ کر باہر نکلی۔ ندرت اور ابا مشترکہ طور پہ صداقت کو ڈانٹ رہے تھے۔ اسامہ زینے اترتا آ رہا تھا۔ سر جھکا ہوا تھا۔ وہ آخری سیڑھی تک پہنچا تو حسینہ نے کمر پہ ہاتھ رکھے' آنکھیں گھما کر مزے سے اطلاع دی۔ ''اسامہ بھائی.....وہ تو چلا گیا سامان سمیت۔ اب ناشتہ بناؤں یا نہ بناؤں؟''

''کون؟'' اسامہ سر اٹھا کر ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگا اور پھر جس لمحے اسے سمجھ آئی.....وہ ایک دم باہر کو بھاگا۔ لاؤنج ایک جست میں عبور کرتا وہ پورچ کے دروازے سے باہر جا نکلا۔ حسینہ نے (ہونہہ) سر جھٹکا۔ (پاگل!)

اسامہ نے باہر آ کر گردن ادھر ادھر گھمائی۔ وہاں سعدی کہیں نہ تھا۔ صرف زمر جھولے پہ آنکھیں موندے سر پیچھے گرائے بیٹھی تھی۔

''بھائی چلا گیا' پھپھو!'' زمر نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ وہ حواس باختہ سا اس تک آ پہنچا تھا۔

''آپ نے بھائی کو جاتے دیکھا؟''

''ہاں دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔ دھیان نہیں دیا.....مگر وہ آیا کب؟ اور وہ چلا کیوں گیا؟'' وہ حیران سی جگہ سے اٹھی۔ یاد آیا رات فارس فون پہ کچھ کہہ رہا تھا۔ اسامہ نے روہانسا ہو کر اسے دیکھا۔

''کیونکہ میں نے ان کو کہا تھا کہ.....''

باہر گھنے درختوں کی قطار کے ساتھ سڑک پہ وہ سر جھکائے چلتا جا رہا تھا۔ بیگ کندھے پہ تھا اور ہاتھ جینز کی جیبوں میں تھے۔

''سعدی!'' اس نے وہ آواز سنی تو قدم زنجیر ہوئے۔ وہ ٹھہرا۔ پھر دھیرے سے مڑا۔

دور.....دس بارہ میٹ کے فاصلے پہ زمر کھڑی تھی۔ رات والے جھلملاتے سیاہ لباس پہ جیکٹ پہنے' گھنگریالے بال آدھے باندھے وہ بہت دلگرفتہ سی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہیں دور کھڑی.....ننگے پاؤں، اس سے چند قدم وہ پیچھے اسامہ کھڑا تھا مگر اس نے چہرہ جھکا رکھا تھا۔

سعدی کے چہرے پہ کرب سا ابھرا۔ زمر پہ اپنائیت بھری نظریں جمائے وہ بار بار کچھ کہنے کو لب کھولتا پھر بند کر دیتا۔ پہلو میں گرے [illegible]

تھکے پاؤں کھڑی زمر نے سینے پہ بازو لپیٹے اور مغموم مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

''خدا حافظ کہے بغیر جا رہے تھے کیا؟ اور اس سلام کا کیا جو خدا حافظ سے پہلے کہنا تھا؟''

سعدی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ وہیں کھڑا اسے اپنی مغموم نظروں سے دیکھتا رہا۔ دونوں کے درمیان کئی گز کا فاصلہ تھا۔

''سلام!'' اس نے سر کے خم سے سلام کیا۔ آواز گیلی روکھی سی تھی۔

''تم ہماری سلامتی چاہتے ہو تو جا کیوں رہے ہو؟'' وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں اونچی کر کے بولی تھی۔

''نہیں رہ سکتا یہاں۔ وحشت ہوتی ہے مجھے۔ دل ٹوٹا ہوا ہے میرا۔'' وہ جب بولا تو الفاظ سرگوشی میں ادا ہوئے مگر نگاہیں زمر پہ جمی رہیں۔ ان میں بے چارگی، خودترسی، شکستگی، سب کچھ تھا۔

''ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب تین گولیاں لگتی ہیں اور سارے اپنے چھوڑ جاتے ہیں، ایسا ہی لگتا ہے۔'' وہ پکار کر بولی تھی۔ ''جیسے سب آپ کے بغیر مزے کر رہے ہیں اور صرف آپ تنہا اذیت کاٹ رہے ہیں۔ میں اس سے گزر چکی ہوں۔ تم گزر رہے ہو۔ چناؤ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ وہ کرنا ہے جو میں نے چار سال پہلے کیا تھا؟ سب کو اپنی زندگی سے باہر دھکیل کر دروازے بند کر کے خود کو اکیلا کرنا ہے۔ یا پھر دروازہ کھولنا ہے؟ اور روشنی کو اندر آنے دینا ہے؟ کیونکہ کچھ لوگ اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے لئے کھولا جائے۔'' بولتے بولتے اس کو سانس چڑھنے لگی تھی مگر اس پہ نگاہیں جمائے وہ بے چارگی سے... تم نے چننا ہے۔ تم نے فیصلہ کرنا ہے... اپنے چاہنے والوں سے دور رہ کر خود کو جوڑ لو گے تو جاؤ، خدا حافظ کہہ کر نکل جاؤ، اور اگر میری غلطیوں سے سبق سیکھنا ہے تو واپس آؤ اور مجھے سلام کہو۔'' وہ کہہ کر سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی منتظر سی اسے دیکھتی رہی۔ اس کا دل اندر بہت زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اگر وہ چلا گیا تو؟

''میرے اندر کا زہر سب کو ہرٹ کرے گا اگر میں یہاں رہا تو۔''

''نہیں سعدی۔ بات یہ ہے کہ تمہیں نفرت ہے اس کام سے جو حنین نے کیا کیونکہ تمہیں محبت ہے حنین سے۔ فیصلہ تم نے کرنا ہے۔ اس کے کام سے نفرت زیادہ شدید ہے یا اس کی محبت زیادہ شدید ہے۔ جس میں زیادہ شدت ہوگی وہ تم سے چناؤ کروا لے گی۔''

سعدی نے خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھا.... اور اس کے عقب میں چہرہ موڑے کھڑے ہیم کو۔ ''مجھے نہیں لگتا اب کسی کو میری ضرورت ہے۔ سب میرے بغیر رہنا سیکھ چکے ہیں۔'' اسامہ کے جھکے چہرے پہ ایک آنسو لڑھکا تھا۔

''اسی لیے سب تمہیں اپنی زندگی میں واپس لانا چاہتے ہیں۔ ضرورت کے تحت نہیں۔ کسی کو تمہاری ضرورت نہیں ہے سعدی۔ مگر محبت کے تحت۔ اور کیا تمہیں ابھی تک سمجھ نہیں آیا کہ رشتے وہ زیادہ خالص ہوتے ہیں جن میں محبت ضرورت پہ حاوی ہو جائے۔''

اور اس لمحے.... گھنے درختوں کی قطار کے قریب چھایا میں کھڑے سعدی یوسف کو اس دھندلی صبح سب کچھ صاف نظر آنے لگا تھا۔ ایک دم سے دماغ اور دل کے آئینے کی ساری گرد کسی نے ہاتھ پھیر کر صاف کر دی تھی۔ وہ چونک کر زمر کو دیکھنے لگا۔ وہ ابھی تک سینے پہ بازو لپیٹے ... نظروں سے ... رہی تھی۔

سعدی نے بیگ نیچے ڈال دیا۔ پھر قدم بہ قدم چلتا وہ فاصلہ عبور کرنے لگا۔ زمر وہیں کھڑی رہی۔ وہ آگے بڑھتا آیا۔ یہاں تک کہ اس کے بالکل مقابل آ کھڑا ہوا۔ پھر بھیگی آنکھیں اٹھائیں اور ''السلام علیکم!'' کہتے ہوئے اس کے گرد اپنے بازو لپیٹ کر اسے خود سے لگایا۔

''میں کہیں نہیں جا رہا۔ مجھے کہیں نہیں جانا۔''

اسامہ خاموشی سے سعدی کی سابقہ جگہ تک آیا اور اس کا بیگ اٹھا کر گھر کی طرف بڑھ گیا۔ زمر نے اس سے علیحدہ ہوتے مسکرا کر نم آنکھوں سے اس کے چہرے پہ ہاتھ پھیرتے اسے دیکھا۔ ''ویلکم ہوم!''

یہ وہ بچہ تھا جس کو اس نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تھا۔ جو رات کو کہانی سنے بغیر نہیں سوتا تھا۔ اسے آج بھی کہانیاں سنانے کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ وہ صرف ''باتوں'' سے سمجھتا تھا۔ اسے صرف باتوں کا فن آتا تھا۔ اس کو یوں اپنے سامنے دیکھ کر..... ہسپتال کی رات جب سے وہ کھویا تھا..... سے لے کر نو ماہ بعد..... اس کو یوں اپنے سامنے کھڑے دیکھنا.....اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرنا، اسے مسکرا کر تسلی دینا.....زمر کو لگ رہا تھا اسے اس کی ساری دنیا واپس مل گئی ہے۔ وہ پہلے سے دبلا پتلا ہو گیا تھا۔ کمزور۔ منہ کا زخم بھی قدرے مندمل تھا مگر بہرحال موجود تھا۔

''سچ سچ بتاؤ' کیا اس نے بہت زور کا مارا تھا تمہیں؟'' وہ اس کی کہنی تھامے گھر کی طرف ٹہلتے ہوئے واپس آتی اس سے پوچھ رہی تھی۔

سعدی نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''کس نے؟''

''فارس نے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔'' وہ خفگی سے سر جھٹک کر سامنے دیکھتا چلنے لگا۔ زمر نے گہری سانس بھری۔ اسے کیوں بھول گیا تھا کہ وہ چھ فٹ کا ایک نوجوان تھا جو کبھی اپنے گھر کی عورتوں کے سامنے مار کھانے کا تذکرہ نہیں کر سکتا تھا۔

اتنے عرصے بعد ملے تھے۔ وہ موقع کی مناسبت سے اس سے چھوٹی چھوٹی مگر محتاط سی باتیں کرتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ زیادہ جواب نہیں دے رہا تھا۔ بس چپ تھا۔

وہ دونوں گیٹ سے اندر چلے گئے مگر اسامہ اس کا بیگ لئے وہیں پورچ کے ایک کونے میں بیٹھا رہا۔ وہ کسی گہری فکر مند سوچ میں تھا جب باہر سے کار اندر آتی دکھائی دی۔ تب وہ جگہ سے اٹھا۔ فارس ڈرائیونگ ڈور کھولتا' چابی جیب میں اڑستا باہر نکل رہا تھا۔ اسے یوں بیٹھے دیکھ کر ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔

''اے...تم ادھر کیا کر رہے ہو؟ اسکول نہیں جانا؟'' وہ لمبے ڈگ بھرتا اس تک آیا۔

''سعدی بھائی گھر چھوڑ کر جا رہا تھا۔ شکر ہے زمر پھپھو نے روک لیا۔'' اس نے ہلکے پھلکے انداز اور ہلکے دل کے ساتھ اطلاع دی۔ فارس کے ماتھے پہ بل پڑے۔ غصے سے اندر کھلتے بند دروازے کو دیکھا۔

''جناب کا دماغ درست نہیں ہوا ابھی تک۔ دو ہاتھ اور لگنے چاہیے تھے اسے۔ اس کی تو آج میں طبیعت صاف کرتا ہوں۔''

''ماموں!...تم...'' خفگی سے اسے دیکھا۔ مگر وہ سر جھٹک کر اندر جا چکا تھا۔

ڈائننگ ٹیبل پہ ناشتے کے برتن سجے تھے۔ ندرت تازہ پراٹھے لا کر رکھ رہی تھیں۔ سعدی اب مسکرا کر اباسے دھیمی آواز میں بات کر رہا تھا۔ فارس کو دور سے آتے دیکھا تو سر کو خفیف ذرا سا خم دیا۔ فارس لبوں پہ مسکراہٹ جمائے اس تک آیا۔ اس کا کندھا زور سے دبایا۔ ''ویلکم ہوم سعدی!'' مسکرا کر کہتا اس کی طرف جھکا' اور اس کے کان کے قریب سرگوشی کی۔

''زیادہ ڈرامے کرنے کی ضرورت نہیں ہے' ہیرو۔ واپس آ گئے ہو تو تمیز سے گھر میں رہو۔ ماں کا خیال ہے یا نہیں؟ اب کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تو دیکھنا۔'' برہمی سے اسے آہستہ سے سنا کر وہ سیدھا ہوا اور مسکراہٹ دوبارہ سے لبوں پہ طاری کئے آگے بڑھ گیا۔ سعدی گہری سانس لے کر رہ گیا۔ (واقعی ویلکم ہوم!)

وہ اپنے کمرے میں آیا تو زمر کورٹ کے لئے تیار کھڑی تھی۔ اسے نظرانداز کئے آئینے کے سامنے کھڑی لپ اسٹک لگاتی رہی۔

''آہم!'' وہ ہلکا سا کھنکھارا۔ ''اس ناشتے کا کیا کیا؟''

زمر نے آواز کے ساتھ لپ اسٹک بند کی اور اس کی طرف گھومی۔

''تم فجر پڑھنے گئے تھے یا تراویح؟''

''کیوں میری عبادتوں کو نظر لگاتی ہو؟ استغفراللہ!'' اس نے کان کی لو کو چھوا۔

''کہاں گئے تھے؟'' وہ چبھتی نظریں اس پہ جمائے تفتیشی انداز میں پوچھ رہی تھی۔

''تیسری بیوی کے پاس!'' زمر کے تاثرات بگڑے۔ ماتھے کی تیوریاں بڑھ گئیں۔

''تو پھر ادھر ہی رہتے نا۔'' وہ طنزیہ سر جھلا کر بولی تھی۔ وہ قدم قدم چلتا اس کے قریب آیا۔

''میں اس امر کو یقینی بنانے گیا تھا کہ وہ دوبارہ میرے اور تمہارے کسی ناشتے' کسی کھانے کے درمیان نہ آئے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر اتنے اعتماد اور مان سے بولا کہ زمر کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ بھوری آنکھوں میں امید سی چمکی۔

''وہ اب کبھی بھی کوئی مسئلہ نہیں کرے گی۔ مجھ پہ اعتبار کرو۔'' اس کی آنکھوں کا بھروسہ... اور مان... وہ پگھل گئی۔ اور پھر ہلکا سا مسکرائی۔ ''وہ گئی ہے تو کوئی اور آ جائے گی۔ تم بھی تو عادت سے مجبور ہو۔''

''آپ کی ان ہی اداؤں کو دیکھ کر دل چاہتا ہے کہ... بندہ جیل سے کبھی واپس ہی نہ آیا ہوتا۔'' وہ خفگی سے کہتا پلٹ گیا تو وہ بے اختیار ہنس دی۔

(دو نمبر آدمی....) وہ کمرے سے نکل گیا تو زمر نے ڈریسنگ ٹیبل کی اوپری دراز کھولی اور پیچھے ہاتھ ڈال کر کچھ باہر نکالا۔ سیاہ مخملیں ڈبیا جس پہ زمانوں کی گرد پڑی تھی۔ زمر نے گرد جھاڑی اور اسے کھولا۔ اندر رکھی دمکتی ہوئی ہیرے کی لونگ ہر گرد اور آلائش سے پاک تھی۔ وہ مسکرا دی۔ اس نے لونگ کی ڈبی پرس میں ڈالی اور بال برش کرنے لگی۔ (فارس غازی جب آج ہاکل اسے یہ لونگ پہنے دیکھے گا تو اس کے کیا تاثرات ہوں گے؟ فارس کی شکل دیکھنے کے لائق ہو گی۔)

زمر باہر آئی تو فارس سمیت باقی سب ناشتہ کر رہے تھے۔ اسے پہلے وہ ایلیا کچھ سوچ کر کچن میں آئی۔ گول میز پہ حنین اکیلی چائے پی رہی تھی۔

''حنہ۔ تم ادھر؟'' حنین نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

''جی میں ادھر ہی ہوں۔ اسی گھر میں۔ لیکن کوئی بات نہیں اگر آپ مجھے بھول گئیں۔ کوئی بات نہیں اگر آپ کو میری کمی محسوس نہیں ہوئی۔ حنہ تو ہمیشہ سے پس منظر میں ہوتی ہے۔ یہ اتنے مہینے تو وہ آپ کی نظر میں سعدی یوسف کے sad reminder کے طور پہ موجود تھی۔ اس کے lesser version کے طور پہ۔ مگر اب وہ آ گیا ہے تو میں بھی اپنی پرانی جگہ پہ واپس آ گئی ہوں۔ رہیں آپ تو آپ کے لئے ہمیشہ سعدی سب کچھ تھا۔ صرف سعدی۔ سو آپ ناشتہ انجوائے کریں اور میرے لئے گلٹی فیل نہ کریں۔ مجھے اپنی بدصورت سچائیوں اور اپنے اندر موجود شیاطین کے ساتھ رہنا آ گیا ہے!'' وہ چائے کا مگ اور سیل اٹھا کر سادگی سے کہتی اس کے ساتھ سے نکل کر باہر چلی گئی۔ زمر بالکل خاموش سی ہو گئی تھی۔ اور کچھ خفا بھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ گھر کے ایک فرد کے راضی ہونے تک دوسرا کیوں ناراض ہو جاتا تھا!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اب مہ و سال کی مہلت نہیں ملنے والی

آ گئے اب تو شب و روز عذابوں والے

ہارون عبید اپنے آفس میں کنٹرول چیئر پہ بیٹھے چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے چند کاغذات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ عینک ناک پہ دھری تھی اور انہماک قابلِ دید تھا۔ موبائل بار بار بج رہا تھا۔ بالآخر انہوں نے اسے اٹھا ہی لیا۔ ''بولو بیٹا۔''

''آپ نے فارس سے کیا کہا ہے؟'' وہ رو رہی تھی۔ انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے عینک اتاری۔

''جو امین نے مجھے کہا تھا کہنے کو۔ یہی کہ تم ہسپتال اس لیے ہو کہ... خیر میں جانتا ہوں امین غلط بیانی کر رہا تھا' اور اگر تمہارے توجہ حاصل کرنے والے کام ختم ہو گئے ہوں تو گھر واپس چلی جاؤ۔ کسی کو معلوم ہوا تو نیا تماشا بنے گا۔'' وہ سادہ اور مصروف انداز میں کہہ رہے تھے۔

''بابا آپ ہمیشہ میرے ساتھ یہی کرتے ہیں۔'' وہ روتے ہوئے چلائی تھی۔ ''آپ نے کبھی مجھے کچھ نہیں دیا۔ ہمیشہ میرا راستہ روکا۔ ہمیشہ مجھے ہرٹ کیا۔ آئی ہیٹ یو بابا۔ آئی ہیٹ یو....'' اور روتے روتے اس نے کال کاٹ دی تھی۔

ہارون کا فون پکڑے ہاتھ کان سے لگا رہا تھا' گویا وہ شل سے ہو گئے تھے۔ ساکت۔ متعجب۔ پھر سر جھٹک کر وہ دوبارہ سے کام کرنے لگے مگر چہرے سے شدید ڈسٹرب لگ رہے تھے۔ بار بار فون اٹھاتے پھر رکھ دیتے۔

''تم اس حد تک گر سکتے ہو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'' دروازہ دھاڑ سے کھلا اور جواہرات کار دار تیز تیز چلتی اندر آتی دکھائی دی۔ ہارون نے اکتا کر نظریں اٹھائیں۔ وہ میرون اور سفید لباس میں گہرے میک اور جیولری پہنے ایک طرف جھکی بنی سنوری ہوئی تھی۔ دوسری جانب

''بیٹھ جاؤ جواہرات۔ آج کل تم لوگ کسی کو دھمکانے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔''

''میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی۔'' میز پہ دونوں ہاتھ رکھے جھک کر وہ غرائی۔ ''تم لوگوں نے میری ویڈیو بنائی۔ اور اب تمہاری بیٹی اس ویڈیو کو استعمال کرنے کی دھمکی دے کر گئی ہے مجھے۔ میں نے تم پہ بھروسہ کر کے تمہیں ایک کام کہا تھا اور فصیح نے اسے ریکارڈ کر لیا۔''

ہارون عبید تحمل سے پیچھے ہو کر بیٹھے۔ وہ عمر اور تجربے کے اس دور سے نکل چکے تھے جہاں ''کیا؟ کون سی ویڈیو؟ مجھے نہیں معلوم'' جیسے الفاظ فوراً حیران ہو کر بولے جاتے ہوں۔ انہوں نے جواہرات کے الفاظ کو ذہن میں ترتیب دیا اور ساری تصویر واضح ہو گئی۔

''اور میری بیٹی نے یقیناً یہ بھی بتایا ہو گا کہ کس صورت میں وہ اس ویڈیو کو استعمال نہیں کرے گی۔''

''ہاں بتایا تھا۔ ڈونٹ ٹیل می کہ تم نہیں جانتے۔ لیکن یاد رکھنا میں ہاشم سے کچھ نہیں کہوں گی۔ اس نے اپنی مرضی سے آبی کو پرپوز کیا ہے۔'' (میز پہ رکھی ہارون کی مٹھیاں زور سے بھینچ گئیں۔ ماتھے پہ بل در آیا۔) ''اور میرے کہنے سے وہ نہیں رکے گا۔ اس لئے اپنی بیٹی کو سمجھاؤ، شادی سے انکار کرنا ہے تو خود کرے اور اس ویڈیو کو ضائع کر دو ہارون۔ ورنہ جو میں کروں گی...''

''کیا کرو گی تم؟'' وہ کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ آنکھوں میں غصہ لئے جواہرات کو دیکھا۔ ''وہ ویڈیو ضائع نہیں ہو گی۔ اپنے بیٹے کو سمجھا دو کہ وہ میری بیٹی سے دور رہے۔ ورنہ میں اس کو تمہاری آنکھوں کے سامنے تباہ کر دوں گا۔ ناؤ گیٹ آؤٹ۔ آ جاتے ہیں دھمکیاں دینے۔ پہلے اپنے مسئلے سلجھاؤ۔'' جواہرات برہم سی واپس مڑی اور جب تک وہ باہر گئی ہارون بلند آواز میں بولتے رہے۔

کرسی پہ واپس گرتے ہوئے انہوں نے بے اختیار ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔ وہ شدید مضطرب نظر آنے لگے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

زندہ رہنے کی تمنا ہو تو ہو جاتے ہیں

فاختاؤں کے بھی کردار عقابوں والے

اس سنہری دوپہر حنین اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھی مسکرا کر اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

''کاپی نہیں ہو پا رہا تو کیا ہوا؟ میموری کارڈ تو میرے پاس ہے نا۔'' میموری کارڈ کی فائلز کاپی نہیں ہوتی تھیں اس نے بہت کوشش کر کے دیکھ لی تھی۔ اس نے سلاٹ سے کارڈ نکالا، پھر ایک ننھی سی پلاسٹک کی ڈبی (جس کو اپنے کچھ میموری کارڈز سے اس نے خالی کر لیا تھا) میں اسے ڈالا۔ اپنی الماری کھولی۔ لاک والے دراز میں اسے رکھ کر مقفل کیا اور چابی جوتوں کے خانے میں پیچھے پیچھے کر کے چھپا دی۔ پھر مسکرا کر واپس لیپ ٹاپ پہ آ بیٹھی۔ ان باکس کھولا۔ سیو سعدی یوسف کا پیغام ابھی تک ان باکس میں موجود تھا جس میں احمر کو اس نے ایڈمن بننے کی درخواست دی تھی۔

مسکراتے ہوئے حنین نے پیغام ٹائپ کیا۔ ''یہ ہے میرا نمبر۔ مجھے کال کریں پلیز احمر۔ مجھے سلطان بخش کے بارے میں بات کرنی ہے!'' پیغام بھیج کر وہ کرسی پہ ٹیک لگا کے مزے سے بیٹھ گئی۔ دو سیکنڈ بعد ہی seen لکھا آ گیا۔

احمر آفس کی راہداری میں دو افراد کے ساتھ چلتا جا رہا تھا اور کچھ بول بھی رہا تھا جب موبائل بجا۔ چونکہ ہاتھ میں ہی تھا اس لیے اس نے بات جاری رکھتے ہوئے اسکرین کو چھوا۔ پیغام پڑھ کر اس کی زبان رکی۔ چہرہ فق ہوا۔ ان لوگوں سے معذرت کر کے وہ تیزی سے اپنے آفس کی طرف واپس آیا اور فون کان سے لگایا۔ حنین نے تیسری گھنٹی پہ فون اٹھا لیا تھا۔

''کیسے ہیں آپ کاردارز کے میڈیا منیجر؟ امیج کنسلٹنٹ احمر شفیع صاحب یا مجھے یوں کہنا چاہیے کہ۔۔۔۔سل۔۔۔طان۔۔۔۔'' وقفہ دیا تو وہ جلدی سے بولا۔

''فضول گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بتائیے کیا مسئلہ ہے؟'' ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے وہ پریشانی سے کہہ رہا تھا۔

''مجھے یہ پوچھنا تھا کہ کیا کاردارز ابھی تک ہماری کالز ریکارڈ کر رہے ہیں؟ وہ معصومیت سے بولی۔

''ایسا کچھ نہیں ہے بچے۔ کوئی آپ کی کالز ریکارڈ نہیں کر رہا۔''

''اچھا۔ یعنی پھر ہم تسلی سے بات کر سکتے ہیں۔ میں ایک صاحب کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ ان کا نام سلطان تھا۔۔۔۔''

''حنین! پلیز!'' اس نے پیشانی آستین سے پونچھی۔ سفید چہرہ لیے وہ مضطرب سا فون کان سے لگائے آفس میں ٹہل رہا تھا۔

''نہیں احمر شفیع۔ پلیز تو میں بولوں گی اب۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہمارے تمام فونز اور کمپیوٹرز کی مانیٹرنگ ختم کر دی جانی چاہیے ورنہ میں اپنے پی ٹی سی ایل سے اپنی پھپھو کو کال کروں گی اور ان کو وہ دلچسپ کہانی سناؤں گی سلطان صاحب والی اور میں روز یہی کروں گی۔ روز اپنے ایک رشتے دار کو کال کر کے ان کو وہ کہانی سناؤں گی۔ اب ہماری کالز ریکارڈ کرنی ہیں یا نہیں یہ فیصلہ آپ کا ہے۔ بائی!'' مسکرا کر کال کاٹی اور احمر فون رکھ کر تیزی سے باہر بھاگا۔ لفٹ میں سوار وہ نچلے فلور تک گیا اور بھاگتے ہوئے راہداری عبور کی۔ ایک آفس کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھے کانوں سے ہیڈ فون لگائے شخص کو ''اٹھو۔ باہر جاؤ'' کہہ کر اسے کالر سے اٹھا کر کھڑا کیا اور اس کی جگہ پہ بیٹھا۔

''باہر جاؤ!'' وہ حیران پریشان سا جگہ سے نہ ہلا تو احمر دھاڑا۔ وہ فوراً باہر لپکا۔ اب احمر تیزی سے کی بورڈ کے بٹن دبا رہا تھا۔ اس کی پیشانی سخت سردی میں بھی پسینے سے تر ہو رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ وقت آ گیا ہے کہ ساحل کو چھوڑ کر

گہرے سمندروں میں اتر جانا چاہیے

ہاشم کے آفس میں باوجود سردی کے کسی ہیٹر کی ضرورت نہ تھی۔ ماحول خاصا گرما گرم ہو رہا تھا۔ ہاشم نے برے موڈ کے ساتھ فون رکھا اور سامنے بیٹھی جواہرات کو دیکھا۔

''ایس ایچ او کا تبادلہ ہو گیا ہے۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''اور یہ تمام [illegible] صاحب [illegible] کر رہا ہوگا۔'' جواہرات فکر مندی سے آگے ہوئی۔ وہ [illegible] والے لباس میں تھی اور اب [illegible]

لگ رہی تھی۔ گہرے میک اپ کے باوجود وہ بوڑھی لگنے لگی تھی۔

''کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نوشیرواں کو کوئی گرفتار نہیں کر سکتا۔'' ہاشم نے ناک سے مکھی اڑائی۔

''تم اس کی ضمانت قبل از گرفتاری کروا لو پھر بھی۔''

''ممی کیا ہو گیا ہے؟ یہ non-bailable offence ہے۔ ضمانت نہیں ہو سکتی۔''

''ہو سکتی ہے۔ تم نے رانا برکت والے کیس میں کروائی تھی نا۔''

''ممی وہ غیر معمولی حالات تھے' وہاں بہت سی جائز وجوہات تھیں۔ یہاں نہ ہو سکتی ہے نہ اس چکر میں پڑنے کی ضرورت ہے۔ آپ بے فکر رہیں' کوئی شیرو کو گرفتار نہیں کرے گا۔'' ہاشم نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پورے وثوق سے کہا۔ جواہرات نے مضطرب سا پہلو بدلا۔

''وہ تب سے کمرے میں بند ہے۔ ہاشم تم اس کی فکر کرو۔ فی الحال ہم کتنے کرائسز میں ہیں۔'' ہاشم نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیا مطلب؟ میں اس کی فکر کروں؟ کر تو رہا ہوں۔ میں ہی تو کر رہا ہوں۔ مگر آپ کے یہ الفاظ کہاں سے آ رہے ہیں' ہاں؟'' اس نے ایک تیز گہری نظر ماں پہ ڈالی۔ جواہرات نے چائے کا کپ آہستہ سے پرچ میں رکھا اور الفاظ ڈھونڈے۔

''آبی والے معاملے' کو کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر کے.....''

''ایک منٹ ممی!'' اس نے سختی سے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ جواہرات کی سانس تک اٹک گئی۔ ''میں نے اس کو پرپوز اس لئے نہیں کیا تھا کیونکہ آپ مجھے بار بار ترغیب دلاتی تھیں۔ میں نے یہ فیصلہ اپنی وجہ سے کیا تھا۔ میری بھی ایک زندگی ہے جسے میں آپ لوگوں کی غلطیاں درست کرنے میں ختم نہیں کر سکتا۔ وہ معاملہ جہاں ہے وہیں رہے گا۔ اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

جواہرات نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا' البتہ اس کی رنگت پھیکی پڑ چکی تھی۔ وہ بے حد شکست خوردہ نظر آ رہی تھی۔

وہ پرس اٹھائے آفس سے باہر نکلی تو احمر چلا آ رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ سے گزرنے لگی تو احمر نے قریب ہو کر سرگوشی کی۔

''مسز کاردار' میں یوسفز کے فون ٹیپ ہنوا رہا ہوں۔'' جواہرات نے چونک کر اسے دیکھا پھر آنکھوں میں غصہ در آیا۔

''یہ ہر کوئی اپنی من مانی کب سے کرنے لگا ہے' تم ہاشم سے پوچھے بغیر.....''

''مسز کاردار!'' وہ نرمی سے سرگوشی میں بولا۔ ''وہ لڑکا سعدی.....وہ کال کر کے کسی سے خاور کی بات کر رہا تھا۔ خاور کو پھنسانے کی۔ آپ کا نام لے رہا تھا۔ میں اسی لئے ٹیپ ہنوا رہا ہوں' بے فکر رہیں' میں آپ کا وفادار ہوں۔'' سمجھانے والے انداز میں وہ بولا تو جواہرات گہری سانس لے کر رہ گئی۔ رنگت مزید پھیکی پڑی۔ (ہر طرف سے گھیرا تنگ ہو رہا تھا۔ ہر شخص ٹائم بم بنا ٹک ٹک کر رہا تھا۔)

''ٹھیک ہے' تم نے درست کیا۔ ویسے بھی اب کال ٹیپنگ کی ضرورت نہیں رہی ہے۔'' وہ تھکے تھکے سے انداز میں کہہ رہی تھی۔

''سرکار! آپ پریشان مت ہوں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

راہداری میں باریک ہیل سے چلنے کی آواز آئی تو وہ دونوں جو قدرے الگ تھلگ کھڑے تھے چونک کر دیکھنے لگے۔ سامنے سے شہرین چلی آرہی تھی۔ رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس، بالوں کو الٹے سیدھے فیشن کے مطابق باندھے وہ ان کو نظر انداز کر کے ہاشم کے آفس کی طرف بڑھ گئی۔ جواہرات کی چبھتی نظروں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

''احمر.... مجھے خاور سے نجات چاہیے۔'' وہ بے بسی سے دبی دبی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''ہاشم کہہ رہا تھا اس نے کال کی ہے اس کو۔ ہمیں کچھ کرنا ہوگا احمر!''

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہم کو اس عہد میں تعمیر کا سودا ہے جہاں

لوگ معمار کو چن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ

شام کا نیلگوں اندھیرا ہر سو گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ کالونی کے گھروں کے پورچ اور گیٹ کی بتیاں جلنے لگی تھیں۔ مغرب کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ پرندے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ ایسے میں فارس غازی کالونی کی مسجد میں موجود تھا۔ سنگ مرمر کی چوکی پہ بیٹھا، وہ جھک کر نل سے وضو کر رہا تھا۔ پانی اس کے کانوں کی لو اور ٹھوڑی سے ٹپک رہا تھا اور نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ پاؤں دھو کر وہ سیدھا کھڑا ہوا، پھر سوئیٹر کے آستین برابر کرتا صحن کی طرف بڑھ گیا۔

مسجد دھیرے دھیرے نمازیوں سے بھر رہی تھی۔ اسے پہلی صف میں جگہ نہیں مل سکی، شاید اس نے کوشش ہی نہیں کی۔ ابھی اتنی جلدی اتنے آگے کھڑے ہونے کی ہمت نہ تھی۔ تیسری صف میں وہ دو نمازیوں کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ پیر سے پیر ملا لیا۔ اردگرد موجود لوگوں کی اکثریت کو وہ نہیں جانتا تھا۔ علاقہ نیا تھا، ابھی جان پہچان میں وقت لگنا تھا۔ اس اجنبی ہجوم میں وہ تنہا تھا۔ لوگ بولتے، باتیں کرتے، صفیں برابر کر رہے تھے۔ وہ بھی سر جھکائے کھڑا رہا۔ امام صاحب نے تکبیر تحریمہ پڑھی تو اس نے کانوں تک ہاتھ اٹھاتے اللہ اکبر کہتے بازو سینے پہ باندھے۔ اب وہ قدرے پرسکون انداز میں عربی کلمات پڑھنے لگا تھا۔ دھیرے دھیرے بے چین دل کو قرار آ رہا تھا۔

سلام پھیر کر جب ہر شخص کو جانے کی جلدی تھی، وہ سر جھکائے دوزانو وہیں کتنی ہی دیر بیٹھا رہا۔

''میں اچھا آدمی نہیں ہوں، مانتا ہوں۔'' سر جھکائے وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔

''میرے ارادے برے تھے، یہ بھی مانتا ہوں۔ میں خاور کو قتل کرنا چاہتا تھا، اس نے میرے بے گناہ بھائی اور معصوم بیوی کو مارا تھا۔ میں ہاشم اور جواہرات میں سے کسی ایک.... اس ایک کو قتل کرنا چاہتا تھا جس نے اس قتال کا حکم دیا تھا۔ اسی لئے میں کہتا تھا زمر سے کہ ہم الگ ہو جائیں گے مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں خاور کا فیصلہ اللہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ نہ میں اس کے پیچھے جاؤں گا۔ نہ اس کے خلاف کچھ کروں گا۔

[illegible]

انصاف چاہیے مجھے۔ عدالت نہیں دے گی جانتا ہوں۔ خود لینا پڑے گا' مانتا ہوں۔ مگر ہاں اب... اب میں اس سے الگ نہیں ہونا چاہتا۔ اب میں خوش ہوں۔ اب میں ٹھیک ہوں۔ اب روشنی نظر آنے لگی ہے۔ اب لگتا ہے کہ میرا ٹوٹا ہوا دل جڑ جائے گا۔ محبت مٹی محبت سے heal کر دیتی ہے' ہمیں' اے اللہ!'' سر جھکائے چہرے پہ ہاتھ پھیر کر وہ اٹھا تو نمازیوں کا ہجوم تتر بتر ہو چکا تھا۔ وہ چپ چاپ مسجد سے نکل آیا۔ جوتے پہنے اور ٹھنڈی خوشگوار ہوا میں چلتا ہوا گھر کا فاصلہ عبور کرنے لگا۔ اس کا چہرہ پہلے سے پرسکون اور مطمئن لگتا تھا۔

اس کے جوگرز میں مقید پیر تارکول کی سڑک عبور کر رہے تھے۔ تیز تیز... اور شاید گزرے برسوں کا فاصلہ بھی طے کر رہے تھے۔ نیلگوں اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔

تارے آسمان پہ نمودار ہونے لگے تھے... ٹھنڈے میٹھے تارے.....

وہ دونوں سنیما کے ہال میں موجود تھے۔ اندھیر کرسیوں پہ پیچھے کو ٹیک لگائے وہ کان کی لو مسلتا نگاہیں اسکرین پہ جمائے ہوئے تھا۔ گاہے بگاہے ساتھ بیٹھی زرتاشہ کو بھی دیکھ لیتا جو بالوں کو ہیئر بینڈ میں مقید کیے' ہاتھ میں پکڑے nachos وقفے وقفے سے کھاتی انہماک سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ مر جائے گا۔'' کچھ دیر بعد وہ بے چینی سے بولا۔ فلم اسے بور کر رہی تھی۔ زرتاشہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''آپ نے دیکھ رکھی ہے پہلے؟'' وہ مایوس ہوئی تھی۔

''نہیں یار۔ صاف پتہ چل رہا ہے۔ اچھا اب اس کی شکل مت بناؤ۔ اسے دیکھو....'' زرتاشہ نے خفگی سے سر جھٹک کر چہرہ واپس موڑا تو وہ گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

چند لمحے بعد انٹرمیشن کا نشان ابھرا اور ہال کی بتیاں جل اٹھیں۔ لوگ اٹھ اٹھ کر باہر جانے لگے۔ وہ دونوں وہیں بیٹھے رہے۔ تین چار لڑکوں کا گروہ ان کی قطار میں آگے بڑھتا ان تک آ رہا تھا' گویا اب ان کے سامنے سے تنگ سی جگہ سے گزر کر جائے گا۔ وہ فارس کی دائیں طرف سے آ رہے تھے' سو فارس نے جوگرز لمبے کر کے پچھلی قطار کی نشست پہ رکھ دیے اور سینے پہ بازو لپیٹے قدرے نیم دراز ہو گیا۔ لڑکے رک گئے۔ جان گئے کہ وہ نہیں چاہتا وہ اس کی بیوی کے سامنے سے گزر کر جائیں۔ وہ واپس مڑ گئے۔

''آپ کو میری بات یاد ہے! مجھ سے نہیں لڑیں گے۔ میرے لیے لڑیں گے۔'' وہ مسکرا کر اس کو دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

فارس نے ہلکے سے کندھے اچکائے۔ ''لڑتا تو ہوں تم سے۔''

''جانتی ہوں مگر اس دن آپ نے روبینہ آنٹی کے سامنے میری حمایت کی کہ زرتاشہ نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی' حالانکہ میں نے کہی تھی۔'' وہ میکے میں کوئی بات سے بات نکلنے والے ایشو کا تذکرہ کرنے لگی۔

فون کالز تو یہ کالز بھی نہیں کرتے۔ فون پہ باتیں صرف بگڑتی ہیں کیونکہ پوری سمجھ نہیں آتیں۔ لیکن جب بھی تم خاندان میں کسی کے بارے میں کوئی بات کیا کرو تو اس کو own کیا کرو۔ اس کے لئے لڑا کرو اس پہ ڈٹ جایا کرو۔ کسی خالہ پھپھی یا بھابھی کے ڈر سے مکر نہ جایا کرو کہ میں نے کسی کو نہیں بتایا۔ میں نے تو کچھ نہیں کہا' وغیرہ۔ بات کو اس کے گھر پہنچایا کرو۔''

''مانا کہ میری غلطی تھی مگر آپ نے ان کے سامنے میری حمایت کی تھی' مجھے اچھا لگا تھا۔'' وہ نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ فارس نے پھر ہلکے سے کندھے اچکائے۔

''تم غلط کرو گی یا صحیح' میں دنیا کے سامنے ظاہر ہے تمہیں ہی سپورٹ کروں گا۔ اگر آپ اپنے گھر کی لڑکیوں کو ان کی غلطیوں کے لئے معاف کر کے ان کو سپورٹ نہیں کر سکتے' ان کا ہاتھ تھام کر ان کو ان کے پورے قد کے ساتھ کھڑا نہیں کر سکتے تو آپ کیسے مرد ہوئے! انسان تو بہت سے ہوتے ہیں۔ مرد کوئی کوئی ہوتا ہے۔''

''بس اتنا بتا دیں کہ یہ فلم والا مر د مرے گا تو نہیں؟'' وہ مسکراہٹ دبا کر بولی۔

''میں اول تو اسے مرد مانتا نہیں ہوں' دوم' ہاں یہ مر جائے گا۔ نہیں' میں نے یہ فلم نہیں دیکھ رکھی۔ میں نے صرف ریویو میں ساری کہانی صبح پڑھ لی تھی۔'' وہ یونہی نیم دراز' ٹیک لگائے مسکرا کر بتا رہا تھا۔

''تاکہ آپ میری فلم خراب کر سکیں!'' اس کی آنکھوں میں پھر سے ناراضی ابھری۔

''مجھے ایک قدم آگے رہنا اچھا لگتا ہے زرتاشہ!''

مغرب پوری طرح ڈھل چکی تھی۔ اس کے جوگرز سڑک کو گویا اپنے نیچے لپیٹتے تیز تیز فاصلہ عبور کر رہے تھے۔ سبز بیلوں سے ڈھکا بنگلہ سامنے تھا۔ وہ گہری سانس لے کر ماضی کی یادوں کو ذہن سے جھٹکتا اندر داخل ہوا۔

لاؤنج میں وہی لوگ تھے جو روز ہوتے تھے۔ مگر آج لگتا تھا سب کے چہروں پہ مسکراہٹیں ہیں۔ راہداری سے گزرتے وہ کچن کے کھلے دروازے میں ذرا دیر کو ٹھہرا۔ سعدی سلیب کے ساتھ کھڑا تھا' اور سر جھکائے مسکرا کر سامنے کرسی پہ بیٹھی زمر کو سن رہا تھا جو دھیرے دھیرے بتا رہی تھی.... ''پھر ہم نے فارس کے کیس کے دنوں میں.....''

پرانی کتھائیں....طویل قصے۔ زمر کی اس کی طرف پشت تھی۔ سعدی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک ثانیے کو ٹھہرا' پھر اسے آواز دی۔

''سعدی!'' سعدی نے چونک کر سر اٹھایا۔ زمر نے بھی گردن موڑی۔ (فارس کو دیکھ کر اسے پرس میں رکھی لونگ یاد آئی۔ او وہ ابھی تک نہیں پہنی۔ اپنی بھول پہ افسوس ہوا۔)

''اپنا پاسپورٹ مجھے دے دو۔'' اس نے عجلت میں پوچھا گویا زیادہ دیر مخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مگر مخل کرنے کا بہانہ بھی چاہیے تھا۔

[illegible]

”کیا مطلب ڈیسیوز آف کر رہا ہے؟ میں نے کہا تھا میں اسے خود ڈیسیوز آف کروں گا۔ وہ صباحت نے اپنا کیریئر داؤ پہ لگا کر تمہارے لئے بنوایا تھا۔ تمہیں یقین ہے وہ کسی کے ہاتھ نہیں لگے گا۔“ اس نے فکرمندی سے پوچھا تھا۔

”اس کے اتنے ٹکڑے کیے تھے کہ اب وہ نہیں ملے گا کسی کو۔ فکر نہ کریں!“ سعدی نے ہاتھ اٹھا کر تسلی دی۔

”مگر.....“

”فارس۔ وہ کہہ رہا ہے تو اس پہ بھروسہ رکھو!“

زمر کی بات پہ اس نے ”اچھا جی!“ کہہ کر سر کو خم دیا اور برے موڈ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ وہ دونوں پھر سے باتوں میں لگ گئے تھے۔

”آپ اکیلے نہیں ہیں۔“ دو قدم آگے بڑھا تھا کہ سیم کے کمرے کے دروازے پہ کھڑی حنین نے پکارا۔ وہ رکا۔ غور سے اسے دیکھا۔

”اگر تم سمجھتی ہو کہ میں جیلس ہو رہا ہوں تو.....“

”میں سمجھتی نہیں ہوں، مجھے یقین ہے۔ خیر ہے۔ ہوتا ہے ایسے۔“ الفاظ کے برعکس اس کا لہجہ شگفتہ نہ تھا۔ چہرے پہ عجیب ویرانی تھی۔ کہہ کر وہ پلٹ گئی اور سیم کے بیڈ پہ آ بیٹھی۔ (وہ ٹیوشن جاتا تھا اس وقت۔) اداس اور ویران۔ یکا یک دروازہ بند ہو کر لاک ہونے کی آواز آئی تو حنہ نے چونک کر سر اٹھایا۔

فارس دروازہ مقفل کر کے کرسی لے کر اس کے سامنے آ بیٹھا اور آگے ہو کر غور سے اسے دیکھا۔ ”حنین! کیا مسئلہ ہے؟ سیم نے مجھے نہیں بتایا۔ مگر تمہاری اور سعدی کی کیا لڑائی چل رہی ہے؟“

ڈھیلی سی فرنچ چوٹی بنائے، کٹے بال ماتھے پہ بکھیرے زرد چہرے والی حنین کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

”آپ تو ہمیشہ دو قدم آگے رہتے ہیں، آپ کو ابھی تک کسی نے نہیں بتایا؟“

”کیا؟ مجھے واقعی نہیں پتہ!“ وہ ٹھٹکا تھا۔ حنہ بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

”وہ آپ کو بتا دے گا۔ بھائی۔ وہ بتا دے گا اور آپ مجھ سے نفرت کریں گے۔“ فارس چند ثانیے بغور اس کی آنکھوں کو دیکھتا رہا۔

”کیا کیا ہے تم نے؟“ الفاظ ہموار اور پرسکون تھے، مگر سوال قیامت تھا۔

”ایسے ہی قیامت کے دن اور اس سے پہلے قبر میں پوچھا جائے گا کہ کیا کیا ہے تم نے حنین۔ کیا کر کے آئی ہو؟ میں کیا کہوں گی؟“

آنسو اس کی آنکھوں سے پھسل پھسل رہے تھے۔

”کسی کو قتل کیا ہے؟“ اس نے سادگی سے پوچھا۔

”نہیں تو۔“ حنہ کی گردن نفی میں ہلی۔

”پھر ہر چیز ٹھیک ہو سکتی ہے۔ بتاؤ مجھے۔ کیا کیا ہے تم نے؟“ اس نے نرمی سے پوچھتے ہوئے حنہ کے ہاتھ تھامے۔ وہ ٹھنڈے یخ تھے۔

[illegible]

نیچے لڑھک رہے تھے۔

''آپ مجھ سے نفرت کریں گے۔''

''نہیں کروں گا۔'' اس نے تسلی دی۔

''میں نے ایگزام میں چیٹنگ کی تھی۔ میں نے اوسی پی صاحب کو...'' وہ ہچکیوں کے درمیان سر جھکائے بتاتی رہی۔ وہ توجہ سے سنتا رہا۔

کتھا ختم ہوئی تو حنہ نے بھیگا چہرہ اٹھایا۔

''حنین!'' وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''انسان زندگی میں بہت کچھ کرتا ہے۔ غلط صحیح اچھے برے کام سب کرتا ہے انسان۔ ہر چیز کو تجربہ سمجھ لیا کرو۔ ٹھیک ہے تم سے غلطی ہوئی لیکن تم نے توبہ کر لی نا' بات ختم ہوگئی۔'' وہ سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔

''احمر شفیع جانتا ہے۔ اس نے ہمارے گیٹ پہ آ کر مجھے دھمکی دی تھی!'' فارس ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا' گویا بری طرح چونکا تھا۔ اس نے یہ کتھا بھی سنا ڈالی۔

''یہ کب کی بات ہے؟''

''جب آپ سری لنکا تھے۔'' وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔ ''خیر میں اس سے لے لوں گا ہر چیز۔ وہ کسی کو نہیں بتائے گا۔''

''وہ آپ کو وہ سارے ثبوت نہیں دے گا۔''

''اس کا تو باپ بھی دے گا۔''

حنین چپ ہوگئی۔ ''اس کا باپ... خیر کسی اور کے راز کھولنے سے پہلے... ایک اور بات...'' اس نے اب کی بار سر نہیں جھکایا۔ اب سر اٹھا کر بات کرتی تھی۔ آنکھوں میں دیکھ کر۔ اس کے ہاتھ پہ اپنے کمزور ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر کے۔

''میں نے کچھ اور بھی کیا ہے۔ جس کی وجہ سے بھائی مجھ سے ناراض ہے۔''

''اور وہ کیا ہے؟'' وہ بنا پلک جھپکے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''آپ نے مجھے منع کیا تھا مگر میں بہت اکیلی تھی' مجھے کوئی اپنا دوست نہیں لگتا تھا۔ میں... میں ہاشم بھائی سے ٹیکسٹ پہ بات کرتی تھی... میں...'' اسے لگا فارس کے ہاتھ اس کے ہاتھ سے پھسلنے لگے ہیں' وہ ہلکا سا چونکا تھا' ڈھیلے اعصاب تن گئے تھے' حنین نے اپنے پسینے میں ڈوبے ہاتھوں سے اس کے ہاتھ پہ گرفت مضبوط کر دی۔ بس ان ہاتھوں کو وہ نہیں چھوڑ سکتی تھی' وہ نہیں کھو سکتی تھی۔

''آئی ایم سوری... مجھے نہیں پتہ تھا میں کیا کر رہی ہوں... میں ان کو پسند کرنے لگی تھی۔ آئی ایم سو سوری... میں کبھی ان سے ملنے نہیں گئی... انہوں نے بلایا تب بھی نہیں... وہ سعدی بھائی کے ساتھ تھے... بھائی کو ٹارچر کرنے کے لئے مجھے کال کر رہے تھے' بھائی اسی لئے خفا ہے مجھ سے۔ میں نہیں گئی مگر کئی ماہ... کئی ماہ میں ان سے بات کرتی رہی... ٹیکسٹ پہ... ایک دو دفعہ کال پہ... مگر میں ان سے [illegible] کرتی

رہی۔ مجھے ... غلطی ... ہوں ...

تھی۔ آنسو اس کے ہاتھوں پہ بھی گر رہے تھے، یا شاید وہ پسینہ تھا۔ مگر وہ ابھی تک مضبوطی سے اس کو تھامے ہوئی تھی۔

وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ چپ۔ پھر اس نے نظریں جھکا لیں۔ حنین وحشت سے اسے دیکھنے لگی۔ دل ڈوبنے لگا۔

اور پھر فارس نے آہستہ سے اپنے ہاتھ نکال لئے۔ اس کے گیلے ہاتھ تنہا رہ گئے۔ وہ شل بیٹھی رہ گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ باہر پھیلتے اندھیرے کو دیکھتا وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ حنین نے اپنے خالی ہاتھ اپنے تہی دامن میں رکھ لئے ساری دنیا ویران ہو گئی تھی۔

''تم نے کبھی اسے کہا کہ تم اس کو پسند کرتی ہو؟'' وہ کھڑکی سے باہر دیکھتا پوچھ رہا تھا۔ آواز آہستہ تھی۔ بہت آہستہ۔

''انہیں اندازہ ہو گا۔ وہ ہاشم کار دار ہیں۔ میں نے....''

''میں نے پوچھا، تم نے اسے کہا یا نہیں کہا۔'' وہ اب حنہ کی طرف گھوما۔ وہ یک ٹک چہرہ اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

فارس نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس باہر خارج کی اور پھر واپس کرسی کی طرف آیا۔

''سنو حنین!'' وہ سنجیدگی سے اس کے سامنے بیٹھا کہنے لگا تھا۔ ''انسان کا پسند ناپسند پہ اختیار نہیں ہوتا۔ وہ اس کے بعد کیا کرتا ہے اس پہ اختیار ہوتا ہے۔ میں نے بھی جیل میں اچھے برے، بہت سے کام کیے ہیں۔ اتنی عمر ہو چکی ہے کہ اب میں ایک چھوٹی بچی کو جج نہیں کر سکتا۔ میں اس بات کو دوبارہ ڈسکس بھی نہیں کرنا چاہوں گا۔ مجھے اب صرف اس بات کی پرواہ ہے کہ وہ کورٹ میں کیا پیش کرے گا۔''

''کورٹ؟'' حنہ نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ ''کون سا کورٹ؟''

''اگر کوئی ٹرائل ہوا تو وہ تمہیں کورٹ میں بلائے گا اور تمہارے سارے میسجز پرنٹ کر کے وہاں پیش کرے گا۔ آئی ایم سوری حنہ اگر میں کبھی تمہیں یہ یقین نہیں دلا سکا کہ تم اکیلی نہیں ہو، کہ تم مجھ پہ اعتبار کر سکتی ہو۔ لیکن اب جو ہونا تھا ہو گیا۔ مجھے اچھا نہیں لگا مگر میں تمہیں جج نہیں کروں گا۔ کوئی بھی چیز میرے دل میں تمہاری محبت کم نہیں کر سکتی۔ اور ابھی میں بھی کچھ بتاؤں گا تمہیں، تاکہ یہ ثابت کر سکوں کہ میں بھی تم پہ اعتبار کرتا ہوں۔ مگر پہلے مجھ پہ بھروسہ کرو اور بتاؤ کہ ان میسجز میں کیا تھا؟ تم اس سے کیا بات کرتی تھیں؟'' اس نے دوبارہ سے حنہ کے ہاتھ تھام لئے تھے اور وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ نہ نرمی سے نہ سختی سے۔ ضبط اور تحمل سے۔ مگر حنین اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ یک ٹک گم سم سی خلاء میں دیکھ رہی تھی۔

عرصے بعد ایک گتھی سلجھ گئی تھی۔ ایک گرہ کھل گئی تھی۔ ایک سرا ہاتھ میں آ گیا تھا۔

وہ سوال قیامت تھا، اور جواب بھی قیامت سے کم نہ تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حشر کے دن کا غلغلہ شہر کے بام و در میں تھا

ٹنگے ہوئے سوال تھے گڑے ہوئے جواب تھے

اگلے چوبیس گھنٹے کہاں غائب ہوئے' پتہ ہی نہیں چلا۔ ایک دن طلوع ہو کر ڈھل بھی گیا اور چھاتے اندھیرے نے دیکھا' نوشیرواں کاردار اس خوبصورت بنگلے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہا ہے جو کلب کے طور پہ استعمال ہوتا تھا۔ ادھر ادھر ٹولیوں کی صورت بیٹھے لوگ.....ٹہلتے لڑکے لڑکیاں.....سرو کرتے ویٹرز.....ہر کسی نے آنکھ اٹھا کر.....نظر بچا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ بڑے دن بعد نہا دھو کر تیار سا' پرفیوم کی مہک میں بسا' گلاسز آنکھوں پہ چڑھائے' منہ میں چیونگم چباتا چلا آ رہا تھا۔ بار کاؤنٹر کا سٹول کھینچ کر بیٹھا اور سیل فون نکالتے ہوئے بار ٹینڈر کو اپنا آرڈر بتایا۔ سن گلاسز اتار کر گریبان پہ اٹکائیں اور اسکرین پہ انگلی پھیرتا نیوز فیڈ چیک کرنے لگا۔

سرگوشیوں اور اونچی باتوں میں اسے اپنا نام واضح سنائی دے رہا تھا۔ وہ نظر انداز کر کے شروب کے گھونٹ بھرنے لگا۔ اب وہ نہیں چھپے گا۔ نہیں ڈرے گا۔ کون یقین کرے گا کہ اس نے کسی کو مارنا چاہا ہے؟ چند دن میں لوگ بھول بھال جائیں گے۔

دفعتاً اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا ہے۔ شیر دنظر انداز کیے گھونٹ بھرتا' موبائل دیکھتا رہا۔ وہ کسی سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ مگر دھیرے دھیرے ایک عجیب سا احساس رگ و پے میں سرایت کرنے لگا۔ کلب میں چھائی غیر معمولی خاموشی۔ جیسے سب سرگوشیوں میں بول رہے ہوں' اور پھر چپ ہو گئے ہوں۔

''امریکہ میں ایسے موقعوں پہ مرینڈا رائٹس پڑھ کر سنائے جاتے ہیں۔ آفیسر آف لا کہتا ہے کہ تمہیں خاموش رہنے کا حق ہے' کیونکہ تم جو بھی کہو گے وہ تمہارے خلاف عدالت میں استعمال ہو گا۔''

نوشیرواں کاردار بجلی کی سی تیزی سے گھوما۔ اس کی پشت پہ.....سینے پہ بازو لپیٹے.....وہ کھڑا تھا۔ وہ جس کا آسیب اس زیر تعمیر گھر میں بہتے خون سے نکل کر نوشیرواں کے اندر آ بسا تھا۔ وہ آج مجسم صورت اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور آنکھوں میں تپش تھی۔ جیکٹ اور جینز میں ملبوس چھوٹے کٹے بالوں والا لڑکا جس کے منہ پہ زخم کا نشان تھا' اس پہ نظریں گاڑے کہہ رہا تھا۔

''مگر پاکستان میں آرٹیکل تیرہ ہی کافی ہوتا ہے۔ دہرانے کی ضرورت پھر بھی نہیں ہے' ہمیں کیونکہ تم خاموشی سے بھی گرفتاری نہیں دو گے۔''

کسی نے کلب کے لاؤنج کی سفید بتیاں جلا دی تھیں۔ مدھم روشنیوں والا خوابناک ماحول یکدم جیسے تیز روشنی میں نہا گیا تھا۔ بے رحم سفید روشنی نے سب عیاں کر دیا تھا۔ سعدی یوسف کے ساتھ سیاہ وردی والے چند افراد کھڑے تھے۔ نوشیرواں کا رنگ پھیکا پڑا۔ وہ آہستہ سے جگہ سے اٹھا۔

''میں سیکشن 161 سی آر پی سی کے تحت نوشیرواں اور زیب کاردار کو اپنا حملہ آور اور اغوا کار نامزد کرتا ہوں۔ مجھے آٹھ ماہ حبس بے جا میں رکھنے اور جسمانی ذہنی اذیت دینے کا ذمہ دار یہی ہے۔ اور ان کے پاس تمہاری گرفتاری کے وارنٹ ہیں۔'' نوشیرواں نے فوراً موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر آفیسر نے اپنی چھڑی اس کے ہاتھ پہ رکھ دی۔

قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ایک سپاہی آگے بڑھا اور نوشیرواں کے ہاتھ تھامنے چاہے مگر اس نے رکھ کر سپاہی کے منہ پہ مکا جڑ دیا۔

ارد گرد تماش بین لڑکے لڑکیوں نے موبائل کیمرے نکال لئے تھے۔ کلک کلک۔ تصاویر اور ویڈیوز بنائی جا رہی تھیں۔ تین سپاہیوں نے اس پہ حملہ کر دیا تھا اور وہ مزاحمت کرتا رہا، چلاتا رہا، گالیاں دیتا رہا، انہوں نے اسے بینے کے بل کاؤنٹر سے لگایا اور ہاتھ پیچھے سے باندھے۔

ایس ایچ او اب اس کو اس کے حقوق پڑھ کر سنا رہا تھا، اس کے اوپر لگی دفعات کی تفصیل بتا رہا تھا، اور وہ کف اڑاتا غصے سے خود کو چھڑاتا مسلسل چلا رہا تھا۔ ہر زاویے سے لوگ دلچسپی سے ویڈیو بنا رہے تھے۔ پولیس والے اس کو لے کر جا رہے تھے، اور سعدی یوسف آخر میں... ان سب کے پیچھے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا چل رہا تھا۔ مناظر کی عکس بندی جاری تھی... آوازیں اور شور بڑھتا جا رہا تھا.....

باہر اسے پولیس وین میں ڈالا جا رہا تھا۔ سعدی وین سے ذرا فاصلے پہ کھڑا تھا۔ ہاتھ کمر پہ باندھے وہ سوچتی نگاہوں سے وین کو دیکھ رہا تھا جب ایس پی بخت آور چشتی اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔

''آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے اس موقع پہ آنے دیا۔'' وہ نرمی سے سر کو خم دے کر بولا۔

''سعدی خان! میں ان لوگوں سے نہیں ڈرتا۔ ہم اپنے علاقے کے پیر ہیں، گدی نشین ہیں۔ ہمارے ساتھ بہت سے لوگ ہیں۔ صبح عدالت میں پیشی سے پہلے تک نوشیرواں کاردار کا بھائی کیا، اس کا باپ بھی قبر سے اٹھ کر آ جائے تو اس کو نہیں چھڑا سکتا۔'' پھر اس نے سعدی کے کندھے پہ تھپکی دی۔ ''تمہیں انصاف ضرور ملے گا۔ ہر پولیس والا ان کی طرح نہیں ہوتا جن سے تمہارا پہلے پالا پڑا ہے۔ تم بے فکر رہو۔ پولیس اس آدمی کو آج لاک اپ سے نکلنے نہیں دے گی۔'' وہ اسے تسلی دے رہا تھا اور سعدی اس پہ یقین کرنا چاہتا تھا۔

مگر جانے کیوں اب کسی پہ یقین نہیں آتا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جب ڈوبنا ہی ٹھہرا تو پھر ساحلوں پہ کیوں

اس کے لیے تو بیچ بھنور جانا چاہیے

''میرا نام ہے سعدی یوسف۔'' نے وہ تہلکہ نہیں مچایا تھا جو نوشیرواں کاردار کی گرفتاری کی ویڈیو نے مچا دیا۔ چند منٹوں میں وہ ویڈیو نیوز چینلز پہ نشر ہونے لگی۔ مختلف زاویوں سے لئے گئے واضح شاٹس جیسے جیسے اسکرین پہ چلتے گئے، کاردار اینڈ سنز کے شیئرز کی مارکیٹ ویلیو گرنے لگی۔ ہاشم کاردار کی پچھتر سے زائد ملکی کمپنیز سے ایک دم سرمایہ کھینچا جانے لگا، اور پہلی دفعہ ہاشم کو احساس ہوا کہ پانی سر سے اوپر ہو رہا ہے۔

وہ ہارون عبید کے ساتھ..... وکلاء کا ایک وفد لئے..... اس وقت تھانے میں موجود تھا... اور نخوت اور غرور سے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کر بیٹھا تلخی سے ایس پی بخت گیلانی سے مخاطب تھا۔ بحث، دھمکیاں، باتیں، سب گرما گرم ماحول میں بلند آواز میں ہو رہی تھیں۔ سامنے والا بھی اپنے علاقے کا پیر تھا، [illegible] کا [illegible] تھا۔ گردن اس کی بھی نہیں جھکتی تھی، صرف نفی میں ہلتی تھی۔

اوپر سے دباؤ ہے کاردار صاحب۔اب میں اس کو نہیں چھوڑ سکتا۔ہم فیصلہ عدالت میں ہوگا۔“

”ساری زندگی دیکھی ہیں میں نے عدالتیں۔دلچسپ بات یہ ہے کہ ویڈیو میں تو اس لڑکے نے ہم دونوں کا نام بھی لیا تھا‘ پھر حتمی ایف آئی آر میں صرف میرے بھائی کو نامزد کیوں کیا؟“ ان کی بحث جاری تھی۔ایف آئی آر کے مطابق صرف نوشیرواں کاردار ذمہ دار تھا سعدی کے اوپر کیے گئے تمام مظالم کا۔

باہر سر ہداہداری میں وہ دونوں کھڑے تھے۔زمر اور سعدی۔دونوں خاموش سے گہری ہوتی رات کو دیکھ رہے تھے۔

”ہم ہاشم اور ہارون عبید کو کیوں نامزد نہیں کر رہے؟“ وہ یہ بات سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

”ہاتھ والا پرندہ جھاڑی والے دو پرندوں سے بہتر ہوتا ہے۔بجائے اس کے کہ وہ تینوں کمزور کیس کی وجہ سے بری ہو جائیں‘ ہم صرف نوشیرواں پہ فوکس کرتے ہیں۔اس کے خلاف مضبوط کیس بناتے ہیں۔اس کو سزا ملی تو ہاشم جیتے جی مر جائے گا۔“

”لیکن وہ پھر بھی آزاد گھومے گا۔“ سعدی نے تلخی سے سر جھٹکا۔اسی پل سامنے سے دو سپاہی نوشیرواں کو ہتھکڑی لگائے چلے آ رہے تھے۔اس کے چہرے پہ بے چینی تھی اور آنکھوں میں غصہ۔سر جھٹک منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے وہ چلتا جا رہا تھا‘ دفعتاً ان دونوں کو ستون کے ساتھ کھڑے دیکھ کر رکا۔

”میں سمجھا تھا مسز زمر کہ آپ مختلف ہوں گی۔مگر آپ سب ایک جیسے ہیں۔“

”تم اپنے وکیل کی غیر موجودگی میں ہم سے بات نہیں کر سکتے۔“ زمر نے سعدی کے سامنے بازو پھیلا کر گویا دونوں کے درمیان آڑ سی بنائی۔

”تم نے مجھ پہ گولیاں چلائی تھیں۔“ سعدی بھی بپھر کر غرایا۔

”تم نے مجھے گالی دی تھی!“

”تو گالی سے جواب دیتے نا۔گولی سے کیوں دیا؟“ وہ اونچی آواز میں بولا تھا۔

”نوشیرواں تم اپنے وکیل کی غیر موجودگی میں ہم سے بات نہیں کر سکتے۔اسے لے جائیں۔“ وہ تحمل سے سعدی کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور سپاہیوں کو ہاتھ کے اشارے سے جانے کا کہا۔وہ نوشیرواں کو ساتھ لے جانے لگے مگر وہ مڑ مڑ کر سرخ چہرے سے اسے دیکھتا‘ مغلظات بکے جا رہا تھا۔

”میں تم سب کو دیکھ لوں گا۔عدالت میں تمہارے سب گھر والوں کو گھسیٹوں گا۔تمہاری بہن کو گھسیٹوں گا۔“ سعدی کی مٹھی بھنچی۔اس نے دانت پیسے۔تنفس تیز ہوا مگر زمر نے نرمی سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔”اس کی باتیں مت سنو۔نظر انداز کرو۔“

”آپ نے سنا نہیں وہ کیا بکواس کر رہا تھا۔“ اس کی رنگت متغیر ہو رہی تھی۔چہرے پہ بے بسی در آئی تھی۔

[illegible]

''کبھی نہیں۔'' اس نے پورے عزم سے نفی میں سر ہلایا۔

''گڈ! میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔ سعدی گہرے گہرے سانس لیتا خود کو پرسکون کرنے لگا۔

دور راہداری کے سرے پہ ایس ایچ او کے کمرے کے دروازے پہ ہارون عبید نکلتے دکھائی دیے۔ وہ وہیں رک کر زمر کو دیکھنے لگے۔ زمر نے جواباً سعدی کو دیکھا۔

''تم گاڑی میں بیٹھو میں آتی ہوں۔ جاؤ نا!'' وہ اپنے ذہنی خلفشار سے نہیں نکل پایا تھا' سو مضطرب الجھا الجھا سا آگے بڑھ گیا۔ تب ہارون قدم قدم چلتے' ستون کے قریب آ ٹھہرے۔ کلف لگی شلوار قمیض میں ملبوس' وہ چہرے پہ سوچ کی لکیروں کے باعث غیر مطمئن لگتے تھے۔

''مسز زمر..... میں نے آپ سے کہا تھا ہم دوبارہ ملیں گے!'' زمر نے بازو سینے پہ لپیٹ لئے اور تحمل سے ان کو سننے لگی۔ ''آپ مجھے تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔ یہ مسئلے بہت تھکا دینے والے ہوتے ہیں۔''

''بلاشبہ ایسا ہی ہے لیکن میں آٹھ دس سال سے روز ایسے مسئلے نپٹاتی آئی ہوں سو آپ میرے لئے فکر مند نہ ہوں۔'' وہ پرسکون سی بولی تھی۔

''مسز زمر!'' انہوں نے اب کے ترحم سے اسے دیکھا۔ ''مجھے آپ سے ہمدردی ہے' اور میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میری مدد کے بغیر یہ کیس کبھی عدالت میں نہیں چل سکتا۔ آپ جج [illegible] ہاشم..... '' وہ مزید قریب ہو گئے' آواز اب سرگوشی میں بدل گئی تھی اور نظریں زمر پہ جمی تھیں۔ ''کبھی تاریخیں نہیں لینے دے گا آپ کو۔ تاریخ پہ تاریخ دیتا جائے گا۔ لٹکاتا جائے گا۔ بارہ تیرہ سال تک کیس چلے گا۔ ہر سال میں دو پیشیاں ہوں گی۔ گواہ مر کھپ جائیں گے۔ سرکاری ریکارڈ کھو جائے گا۔ اخبارات و میڈیا اس قصے کو بھول چکا ہوگا۔ تیرہ سال آپ تو لڑیں گی اور آپ لڑ سکتی ہیں لیکن آپ کا یہ پیارا سا معصوم سا بچہ نہیں لڑ سکے گا۔ آپ کو ابھی اندازہ نہیں ہوا مگر وہ ذہنی طور پہ نارمل نہیں رہا۔ وہ یا تو تنگ آ کر خودکشی کر لے گا یا کسی دن جا کر ہاشم کو گولی مار دے گا۔ وہ..... اتنا لمبا..... انتظار..... نہیں کرے گا مسز زمر!''

زمر کی آنکھوں میں کرچیاں ابھریں' مگر گردن مزید اکڑ گئی۔ ''یہ..... آپ کا..... مسئلہ..... نہیں ہے۔'' نخوت کے انداز میں بولی۔

''مگر آپ کا تو ہے نا۔ اور وہ کیا ہے کہ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔'' وہ نرمی سے ذرا جھک کر بولے تھے۔ ''تیرہ سال..... چلیں دس سال بعد آپ کے ہاتھ میں کیا ہوگا؟ اولاد تو آپ کی ہو نہیں سکتی میں واقف ہوں' (زمر کی آنکھوں میں سرخی ابھری) لیکن جو بچے آپ کے لئے اولاد کی طرح ہیں' وہ رل جائیں گے۔ وہ کبھی دوبارہ زندگی شروع نہیں کر سکیں گے۔''

''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

''میں چاہتا ہوں کہ میں ہاشم کو راضی کر لوں' اور وہ کیس لڑنے کے لئے تیار ہو جائے۔ بار ایسوسی ایشن کے صدر کو پولیس گولیاں مارتی ہے تو [illegible]

زمر صاحب فیصلہ آ جاتا ہے وہ بھی پولیس کے خلاف اس ملک میں جہاں فیصلے آنے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ مگر کیسے؟ کیونکہ وکیل چاہتے تھے کہ فیصلہ آئے۔ اس ملک میں اگر وکیل نہ چاہے تو کوئی فیصلہ نہیں آسکتا' چاہے اس کے حق میں ہو یا خلاف ہو۔ ہاشم چاہے گا تو کیس چلے گا ورنہ نہیں چلے گا۔ اور ہاشم کو صرف میں راضی کر سکتا ہوں اور کوئی شخص یہ کام نہیں کر سکتا۔ آپ کی وہ نئی رفیق صاحبزادی صاحب بھی نہیں۔ اب آپ بتایئے' کیا میں راضی کروں ہاشم کو؟" اب کے وہ پرسکون لگتے تھے' ذرا مسکرا کر ہمدردی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اور یقیناً بدلے میں مجھے کچھ کرنا ہوگا۔ بتایئے' کیا کروں میں جس کے بدلے میں آپ یہ عنایت کریں گے میرے اوپر؟"

"آپ فارس کو چھوڑ دیں!"

آسمان سے کوئی تارہ زور سے ٹوٹ کر گرا تھا' گویا کسی فرشتے نے کسی باتیں اچکنے والے شیطان کو دے مارا ہو۔ تارہ تھا یا آگ کا گولہ۔ زمین پہ گر کر ہر شے کو بھسم کر گیا تھا۔

"میں... فارس کو... چھوڑ دوں؟" وہ چند لمحے سنجیدگی سے ان کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر ایک دم ہنس دی۔ وہ بھی ہلکے سے ہنس دیے۔

"مگر میں سنجیدہ ہوں مسز زمر۔ فارس کو آپ کچھ دے تو سکتی نہیں ہیں' ویسے بھی آپ گردے کی مریض ہیں' آپ کی زندگی کم رہ گئی ہے' اللہ آپ کو زندگی دے میری تو یہ دعا ہے مگر حقیقت پسندی کا مظاہرہ کریں۔ آپ پہلے ہی جس شخص کی زندگی میں بوجھ بنی ہوئی ہیں' اس سے نکل جائیں اور جس بچے سے آپ کو محبت ہے اس کو اس بوجھ سے آزاد کر دیں۔"

"ہارون صاحب۔" اس نے مسکراہٹ دبائے چمکتی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ "آپ اپنی بیٹی کے لیے اتنی تگ و دو نہ کریں تو اچھا ہے۔ اس کی تو ہاشم سے شادی ہو رہی ہے نا' نوشیرواں سے ذکر سنا تھا' سو میرا خیال ہے اس کے مسئلے سنبھالنے کے لئے ہاشم کا رد کافی ہے' اور رہی میں تو....." بائیں کندھے سے لٹکتے پرس کو اتار کر دائیں پہ منتقل کرتے وہ مسکرا کر بولی۔ "جو میرا ہے.....وہ میرا رہے گا!" ایک آخری چمکتی نظر ان پہ ڈال کر وہ مڑ گئی۔

ہارون نرم مسکراہٹ کے ساتھ اسے جاتے دیکھتے رہے۔

چند لمحوں بعد سڑک پہ گاڑی دوڑ رہی تھی۔ ڈرائیونگ کرتا سعدی کچھ کہہ رہا تھا... اور وہ کھڑکی کے باہر بھاگتے پولز اور بتیاں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی جوت بجھ چکی تھی اور گود میں رکھے پرس میں ڈالا ہاتھ مسلسل اندر موجود ڈبی کھول بند کر رہا تھا۔ ٹک...ٹک...ٹک... ننھے تارے جیسے ہیرے والی لونگ کی ڈبی کا ڈھکنا بار بار گرنے اور اٹھنے کے باعث مدھم سی آواز نکالتا تھا.....

ٹک...ٹک...ٹک...

ہاشم رات کے ڈیڑھ بجے تھانے سے گھر چلا آیا۔ پولیس اتنے دباؤ اور جنگل کی آگ کی سی پھیلتی خبر کے بعد کسی صورت نوشیرواں کو [illegible]

[illegible]

نہ تھا۔

"ایک لڑکا جس کو میں نے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح ٹریٹ کیا...." باہر میڈیا کے نمائندوں کے مائیکس کے سامنے چہرہ کیے' کار کا دروازہ کھولے کھڑا وہ کہہ رہا تھا۔ "جس کی بازیابی کے لیے سب سے زیادہ کوششیں میں نے کیں' وہ ذرا سے جائیداد کے تنازعے کے باعث میرے بھائی کو اپنے کیس میں دھکیل رہا ہے' مجھے سوچ کر بھی شرم آتی ہے۔ یو نو واٹ' میں نے اپنی ساری زندگی قانون کی بالادستی کی نذر کی ہے' میں اس موقعے پہ اپنے عہدے اور طاقت کا ناجائز استعمال کر کے اپنے بھائی کو بغیر عدالت میں پیشی کے نہیں چھڑواؤں گا۔ اگر اس کا نام ایف آئی آر میں ہے تو پھر وہ اورنگزیب کاردار کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو' اس کو قانون کے تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا۔ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو دولت یا طاقت کی فراوانی کے باعث خود کو فرعون سمجھنے لگتے ہیں۔ اس لیے کہ ہم پیسے والے ہیں' ہمارے اوپر انگلی اٹھانا بہت آسان ہے۔ یو نو واٹ' اب مزید میں ان لوگوں کو "غریب کارڈ" نہیں کھیلنے دوں گا۔ صبح ہم عدالت جا رہے ہیں اور اپنے بھائی کو وہیں سے چھڑوا کر گھر لائیں گے۔ ہمیں انصاف چاہیے۔ انصاف صرف غریب کے بچے کو نہیں چاہیے ہوتا' ہمیں بھی.... چاہیے!" اور ہاتھ ہلا کر "بس" کا اشارہ کرتا کار میں بیٹھ گیا۔ مائیکس اس کے تعاقب میں جھکے مگر گارڈ کار کا دروازہ بند کر چکا تھا۔ ٹائرز حرکت میں آئے اور کار زن سے آگے بڑھ گئی۔

مور چال کے لاؤنج میں وہ سب بیٹھے ٹی وی اسکرین پہ چلتا نوشیرواں کا کلپ دیکھ رہے تھے۔ (حنین وہاں نہیں تھی۔) سعدی خاموش تھا اور زمر ابا کو بتا رہی تھی کہ کس طرح نوشیرواں اس وقت لاک اپ میں بیٹھا ہے۔

"ہفتے دس دن میں وہ رہا ہو جائے گا' دو دن بعد وہ ملک سے باہر ہوگا' اور اگلے پندرہ سال وہ واپس نہیں آئے گا اور تم دونوں پیچھے سے پیشیاں بھگتنا۔" فارس نے اپنا کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے نہایت پرسکون انداز میں اطلاع دی۔ "ویلکم ٹو پاکستان!" زمر اور سعدی پہ ایک "اچھا سوری" والی نظر ڈال کر' کندھے اچکاتا' مگ ہونٹوں سے لگاتا' وہ آگے بڑھ گیا تو زمر پہلو بدل کر رہ گئی۔

"نہیں نکلے گا وہ باہر!" سعدی اس کے جانے کے چند منٹ بعد ایک دم سے بولا تھا اور پھر اسی طرح اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے تاثرات عجیب سے ہو رہے تھے۔ زمر بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔ پھر بے اختیار سر جھٹکا جیسے کسی کی آواز کو.... جسور جیسی آواز کو ذہن سے جھٹکا ہو.... (آپ اسے اس بوجھ سے آزاد کر دیں۔)

وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ سعدی ہے۔ وہ چند دن میں ٹھیک ہو جائے گا اور ہمیں انصاف ضرور ملے گا۔ وہ خود کو تسلی دینے لگی۔ دل سیاہ آسمان میں بار بار ڈوب کر ابھرتا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سارا جوار بھاٹا میرے دل میں ہے مگر

الزام یہ بھی چاند کے سر جاتا ہے

سعدی نے اوپری منزل پہ بنے اس بیڈروم کا دروازہ کھولا (جو ممی نے اس کے لیے تیار کیا تھا) تو اندر اندھیرا تھا۔ موبائل جیب سے نکالتے ہوئے اس نے سر جھکائے سوئچ بورڈ پہ انگلی رکھی تو کمرہ روشن ہو گیا۔ کسی احساس کے تحت اس نے چونک کر چہرہ اٹھایا۔

اس کے بیڈ کے کونے پہ حنین بیٹھی تھی۔ الجھے سے بال ڈھیلی چوٹی میں بندھے تھے۔ گود میں کاغذوں کا ایک پلندہ رکھا تھا اور زخمی نگاہیں سعدی پہ جمی تھیں۔

''فارس ماموں نے مجھ سے پوچھا کہ.... میں ہاشم سے کیا بات کرتی تھی!''

''حنین میں یہ بات اب ڈسکس نہیں کرنا چاہتا۔ میں جانتا ہوں کچھ عرصے بعد میں اسے بھلا کر تمہیں معاف کر دوں گا اور...'' بیزاری سے سر جھٹکتے وہ آگے آیا تو وہ کھڑی ہوئی۔ اٹھی گردن اور پورے قدم کے ساتھ۔

''معافی مانگی کس نے ہے آپ سے ہاں؟!'' کہنے کے ساتھ اس نے کاغذ سعدی کے قدموں میں پھینکے۔ کچھ نیچے گرے۔ کچھ اڑ کر بکھر گئے۔

''سعدی یوسف خان!'' اس نے صدمے اور غصے سے بھری آنکھوں سے اسے دیکھتے اونچی آواز میں دہرایا۔ ''سعدی... یوسف... خان۔ یہ تھے وہ الفاظ جو ان انیس سو بہتر میسیجز میں پانچ سو چھپن دفعہ استعمال ہوئے ہیں، یہ میرے ان تمام میسیجز کا ریکارڈ ہے جو ان کو بھیجے تھے میں نے۔ بیک اپ سے نکالے ہیں میں نے اور آپ کو دکھانے لائی ہوں۔ دیکھیں انہیں۔ پڑھیں انہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ آپ کو کیا بتا رہا ہے، مگر میں اس سے آپ کی بات کرتی تھی۔ آپ کی، سعدی بھائی! آپ کی بات کرتی تھی میں۔'' بولتے بولتے جذبات سے آواز بوجھل ہوئی اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ بالکل خالی نظروں سے اسے دیکھے گیا۔

''پڑھیں ان میسیجز کو۔ نہیں پڑھیں ان کو پلیز۔ میں نے ہمیشہ ان کو ہاشم بھائی کہا، کبھی غلط بات نہیں کہی ان سے۔ کسی سے ایسی بات کرنا غلط ہے یا صحیح اس سے قطع نظر میں نے کبھی ان سے.... کوئی... غلط بات... نہیں کہی۔ صرف آپ کی یا زمر کی یا گھر میں بڑھتی وحشت کی بات کرتی تھی۔ ہاں میں ان کو پسند کرتی تھی۔ کہیں دور اندر اب بھی پسند کرتی ہوں۔'' اس کی بلند آواز کانپی۔ ''مگر کسی کو پسند کرنا گناہ نہیں ہوتا۔ پسند پہ انسان کا اختیار نہیں ہوتا۔ اس کے بعد وہ کیا کرتا ہے، اس پہ ہوتا ہے۔ میرا قصور نہیں ہے اس میں اگر میں ان کو پسند کرتی ہوں۔ جانتے ہیں کس کا قصور ہے؟'' وہ تین قدم آگے بڑھی اور خاموش لب بھینچے کھڑے سعدی کی آنکھوں میں دیکھا۔

''آپ کا! آپ کا قصور ہے۔'' آنسو اب خشک تھے اور وہ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھتی غرائی تھی۔ ''آپ تھے جو مجھے ان کے گھر لے کر گئے تھے اس رات جب نوشیرواں نے اغوا کا ڈرامہ کیا تھا۔ آپ تھے جو ہاشم کا لاکر کھولنے میں اور اس کا راز جاننے میں اتنے مصروف ہو گئے تھے کہ آپ کو خیال بھی نہیں گزرا کہ آپ کی بہن دوسرے کمرے میں ہاشم کے ساتھ ہے۔ آپ تھے جنہوں نے اس شخص کی اصلیت ڈیڑھ سال ہم سے چھپائی۔ ہمیں دوبارہ ان کے گھر پارٹی پہ لے کر گئے۔ پھر بعد میں آپ مجھے کہتے ہیں کہ اس کو کیوں بلایا کالج؟ ہاں بلایا

[illegible]

لوگوں کو ایسے جج نہیں کرنا چیسے آپ نیک لوگ ہم گناہگاروں کو جج کرتے ہیں۔ کیوں بلایا میں نے اسے کال پہ؟ اس لیے کہ مجھے اس سے امید تھی کہ وہ مجھے برا نہیں سمجھے گا۔ آپ سے یہ امید نہیں تھی مجھے۔ کیوں بات کرتی تھی میں اس سے؟ کیونکہ مجھے کسی نے.... آپ نے بھی بتایا ہی نہیں کہ وہ اندر سے کیسا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا وہ کیسا ہے؟ صرف یہ کہہ دینا کہ اس کو کبھی نہیں بلانا آئندہ کافی نہیں ہوتا۔ مجھے وجہ نہیں بتائی' مجھے اس کی اصلیت نہیں دکھائی.... پھر مجھ پہ الزام کیوں ڈالتے ہیں؟" وہ شل کھڑا سن رہا تھا اور وہ آخر میں ٹھہر کر.... اس کی آنکھوں پہ نظریں جمائے چبا چبا کر بولی۔

"میرے دل کا خون کرنے والے ہاتھ میرے نہیں تھے۔ آپ کے تھے!" پیر کی ٹھوکر سے ان کاغذوں کو مزید بکھیر دیا۔ "آپ کا فرض تھا مجھے بتانا' مجھے اس کی اصلیت دکھانا۔ میں انیس سو دس کی لڑکی نہیں ہوں جس کو دھونس زبردستی سے' ڈانٹ ڈپٹ کر آپ کچھ بھی کرنے پہ مجبور کر سکتے ہیں۔ میں اکیسویں صدی کی لڑکی ہوں' میرے پاس میرا ذہن ہے اور ذہانت ہے۔ میرے دور کی لڑکیوں کے بھائیوں کو یہ بھول جانا چاہیے کہ وہ غصہ کر کے' حکم دے کر' پابندیاں لگا کر اپنی بچیوں کو کسی سے موبائل پہ بات کرنے سے روک سکتے ہیں۔ جب تک وہ برابری کے لیول پہ آ کر اپنی بہن کے ساتھ بیٹھ کر اس کو دلائل سے نہیں سمجھائیں گے' وہ ان کی بات نہیں مانے گی۔ باہر کے لوگ ہمارا دل ایسے نہیں توڑتے بھائی جیسے ہمارے اپنے مرد ہمیں توڑ جاتے ہیں۔" آخری لفظ پہ اس نے ہچکی لی' اور پھر اس کے ساتھ سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ جا چکی تھی اور سعدی تنہا خاموش کھڑا تھا۔ پھر دفعتاً وہ جھکا اور ایک ایک کاغذ اٹھانے لگا۔ سب کو اکٹھا کیا' برابر کیا' اور پھر اسٹڈی ٹیبل کی دراز میں ڈال دیا۔ بغیر پڑھے۔ بغیر دیکھے۔ اس کا چہرہ اب بھی ویسا ہی تھا۔ سنجیدہ اور خاموش۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جلتی ہیں روز جس کے اشارے پہ بستیاں

اس آنکھ تک دھوئیں کا اثر جانا چاہیے

اگلی صبح دھند میں واضح کی محسوس ہوتی تھی۔ سورج نکھرا نکھرا سا نکلا کھڑا تھا اور ہارون عبید کی رہائشگاہ کے سارے شیشے دھوپ سے چمک رہے تھے۔ لاؤنج میں ہارون شلوار سوٹ اور کوٹ میں ملبوس صوفے پہ براجمان سوچتی نگاہوں سے ٹی وی اسکرین کو دیکھ رہے تھے جہاں نوشیرواں کی گرفتاری کی کلپنگ بار بار دکھائی جا رہی تھی۔

"معروف آئی پی پی کا بیٹا نوشیرواں کاردار جس کو کل شام وارنٹ گرفتاری جاری ہونے کے بعد اسلام آباد کے ایک ریسٹ ہاؤس سے گرفتار کیا گیا تھا اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے اور آج اس کو عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ جہاں پولیس اس کے جسمانی ریمانڈ کے لئے درخواست دے گی اور قوی امکان ہے کہ ابھی چند دن تک نوشیرواں کاردار اپنے گھر نہیں جا سکیں گے۔"

ہارون نے [illegible] اسکرین بجھ گئی۔ وہ [illegible] خاموش لاؤنج میں [illegible]

اور پیچھے سے قمیض جھٹک کر برابر کرتے آگے بڑھ گئے۔

اوپر آکر وہ آبی کے کمرے کے سامنے رکے۔ دروازہ کھٹکھٹایا پھر دھکیلا۔

''آبدار۔ بچے تم نیچے کیوں بیٹھی ہو؟'' وہ بیڈ کی پائنتی کے قریب زمین پہ اکڑوں بیٹھی تھی۔ سرخ بال بکھر کر کمر پہ گر رہے تھے اور آنکھیں گیلی تھیں۔ وہ ترحم سے اسے دیکھتے آگے آئے اور بیڈ کے کنارے آبیٹھے۔ ''آبی۔'' انہوں نے دوبارہ پکارا۔

''اسے لگتا ہے میں ڈرامہ کرتی ہوں۔ اسے لگتا ہے میں اس کی نیک نامی کے لئے خطرہ ہوں۔'' اس نے گیلی آنکھیں اٹھا کر گلہ آمیز نظروں سے باپ کو دیکھا۔ ''بابا...۔ مجھے ہر چیز سے وحشت ہونے لگی ہے۔ ہر شخص سے۔''

''آبدار... اتنا نہیں سوار کرتے کسی کو حواسوں پر کہ....''

''یہ اپنے اختیار میں نہیں ہوتا بابا....'' اس نے شکستگی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔ ''میں بہت بری طرح ٹوٹ گئی ہوں۔ میں سارا دن اس کی کال کا انتظار کرتی ہوں۔ میں نے اس کے نمبر کی رنگ ٹون بھی بدل دی ہے کہ اسکرین دیکھنے سے پہلے مجھے اس کی کال کی خبر مل جائے۔ میں ہر چند منٹ بعد واٹس ایپ پہ اس کا لاسٹ سین دیکھتی ہوں۔ اگر وہ آن لائن ہو تو لگتا ہے وہ میری دسترس میں ہے۔ جیسے کوئی ڈوری سی ہو میرے اور اس کے درمیان۔ مگر میں اسے میسج نہیں کر سکتی بابا۔ کیونکہ پھر وہ مجھے بلاک کر دے گا۔ میرا دل بہت ٹوٹا ہوا ہے بابا۔'' اس نے اپنا سر ان کے گھٹنے پہ رکھ دیا اور رونے لگی۔ اس کی شکست خوردگی اور حلیہ بے ترتیب۔

''آبی.... تم کیا چاہتی ہو؟'' انہوں نے اس کا سر تھپکتے ہوئے پوچھا تھا۔

''آپ نے مجھے کبھی کچھ نہیں دیا۔ میری ماں کو بھی مجھ سے چھین لیا۔ مجھے وقت بھی نہیں دیتے۔ میری سالگرہ بھی یاد نہیں رکھتے۔ آپ مجھے ''وہ'' بھی نہیں دے سکتے۔'' نفی میں سر ہلاتی وہ سیدھی ہوئی اور بند مٹھیوں سے آنکھیں رگڑنے لگی۔

''سوائے ہاشم کاردار کے' تم دنیا میں جس کو بھی میرے سامنے لے آؤ گی' میں اسے قبول کر لوں گا۔''

''مجھے ہاشم سے کوئی سروکار نہیں ہے بابا۔'' وہ غصے سے سر جھٹک کر بولی تھی۔ ''مجھے جو چاہیے' وہ unavailable ہے۔ وہ شادی شدہ ہے۔ اور آپ.... آپ کچھ بھی نہیں کر سکتے میرے لئے۔ میں بابا اب ساری زندگی تکلیف میں رہوں گی۔''

اس کی سبز سرمئی آنکھوں کے کٹورے پھر سے بھرنے لگے۔ بارون کچھ دیر غور سے اسے دیکھتے رہے۔

''وہ تمہیں مل جائے گا' میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ اب اٹھو بچے۔ کھانا کھاؤ' اور کپڑے بدلو' پھر اپنے کلینک جاؤ' خود کو کام میں مصروف کرو۔''

مگر وہ ان کے پہلے الفاظ پہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔ ''آپ.... وعدہ کرتے ہیں؟'' مایوسی کے آسمان پہ امید کا تارہ سا چمکا تھا۔

''ہاں میں وعدہ کرتا ہوں۔'' انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر یقین دلایا تھا۔ آبدار کی آنکھوں سے آنسو غائب ہونے لگے...

''مگر...... کیسے؟''

''تم مجھے بتاؤ.... کیسے؟ وہ کیسے آئے گا تمہاری زندگی میں؟''

''وہ جب تک اس کی زندگی میں رہے گی' وہ مجھے نہیں ملے گا بابا۔'' تارہ ڈوبنے لگا۔

''وہ اس کی زندگی سے چلی جائے گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں وہ چلی جائے گی۔''

آبدار کی ان پہ جمی آنکھوں میں کچھ چمکا تھا۔ ''کیسے؟ آپ کو کیسے پتہ؟''

''میں نے رات اس کو دیکھا تھا۔ زمر کو۔ میں نے اس سے بات کی تھی۔ سعدی یوسف کے کیس سے متعلق۔ چہرے پڑھنے آتے ہیں مجھے۔ وہ اسے چھوڑ دے گی بہت جلد۔''

''آپ نے اسے کچھ کہا تو نہیں؟ بابا پلیز آپ ان کو کوئی دھمکی وغیرہ نہیں دیں گے۔ وہ اچھے لوگ ہیں۔ میں.....''

''نہیں میں کیوں کچھ کہوں گا؟ مگر میں تمہیں بتا رہا ہوں' وہ اس کو چھوڑ دے گی۔''

''کیا اس نے خود ایسا کہا؟'' آبی کا دل اٹک گیا تھا۔

''نہیں اسے ابھی خود بھی معلوم نہیں مگر میں تمہیں بتا رہا ہوں بیٹے میں لوگوں کو اخبار کی طرح پڑھتا ہوں' ساری زندگی پڑھتا آیا ہوں۔ وہ ..اسے....چھوڑ دے گی!'' پھر اس کا سر تھپکتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''اب فریش ہو جاؤ۔ میں ڈائننگ ٹیبل پہ تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ کھانا اکٹھے کھاتے ہیں۔''

آبدار کے لبوں پہ نرم مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ سر ہلاتے ہوئے اٹھنے لگی۔ قدموں میں بالکل جان نہیں تھی۔ جانے کب سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ہارون اب اسے سہارا دے کر کھڑا کر رہے تھے۔ چند دن میں ہی وہ اتنی کمزور نظر آنے لگی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وحشتیں بڑھتی گئیں ہجر کے آزار کے ساتھ

اب تو ہم بات بھی کرتے نہیں غمخوار کے ساتھ

دانتے کی جہنم جیسا احاطہ عدالت آج بھی لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ نوشیرواں کاردار کو سپاہی ہتھکڑیوں میں مقید کیے اپنے ساتھ چلاتے لا رہے تھے۔ وہ اسی ویسٹ میں ملبوس تھا جس میں ساری رات لاک اپ میں بیٹھے کاٹی تھی۔ سردی کے باوجود آستین چڑھا رکھے تھے۔ چہرے پہ سنجیدہ تاثر تھا اور آنکھیں شب بیداری کے باعث گلابی پڑ رہی تھیں۔ سامنے سے انسان چلے آ رہے تھے۔ بے نیاز تیز تیز چلتے ہوئے۔ عجیب خوفناک لوگ۔ اور پھر ان کا شور ہی شور۔ وہ سامنے دیکھ کر نہیں چل رہا تھا' نظریں جھکی تھیں۔ اسے راہداری میں چلتے اپنے قدم نظر آ رہے تھے۔ ساتھ میں ہاشم کے چمکتے بوٹ بھی۔ سپاہیوں کے رگڑ رگڑ کر پالش کیے جوتے بھی۔ آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ وکلاء [illegible] بھی۔ سامنے کھڑے صحافی اور کیمرہ مین سوالوں کی بوچھاڑ کرتے [illegible] قدموں کے پیچھے [illegible] رہے تھے۔

''ہاتھ اٹھا کر وکٹری کا نشان بناؤ اور مسکرا کر یہاں سے گزرو۔'' ہاشم نے قریب میں سرگوشی کی۔ اس نے ایک نظر اٹھائی اور چہرے پر مسکراہٹ لاتے وکٹری کی دو انگلیاں اوپر اٹھائیں۔ ایک رات لاک اپ میں کاٹنے کے بعد اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس برزخ سے اسے ہاشم کے علاوہ کوئی نہیں نکال سکتا اس لیے وہ اس کا ہر حکم ماننے کا پابند تھا۔

صحافیوں کا ہجوم ایک جگہ آ کر رکنا تھا رک گیا' وہ لوگ آگے بڑھتے گئے۔ شیرو نے وکٹری کی انگلیاں گرا دیں۔

''یہ ہمارے انویسٹرز کے لئے تھا' ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم پر اعتماد ہیں۔'' ہاشم اسے کہہ رہا تھا۔ وہ نہیں سن رہا تھا۔ نظریں پھر سے جھکا دی تھیں۔

''زیادہ سے زیادہ سات دن تک رہنا پڑے گا تمہیں لاک اپ میں' پھر جیل بھیج دیں گے۔ اس کے بعد میں ضمانت کروا لوں گا' مگر سات یا دس دن میں تمہارا اندر رہنا بہتر ہے۔ optics کے لئے یہ اچھا ہے۔ کوئی بھی خبر میڈیا پہ اس سے زیادہ نہیں شور مچاتی۔ خبر دب جائے گی لوگ تھک کر چپ ہو جائیں گے۔ ان سات دنوں میں ہم تین پارٹیز دیں گے' مختلف جگہ چیریٹی گیدرنگز میں جا کر پیسہ لٹائیں گے۔ یو نو۔ optics کے لئے۔ چند ایک photo -ops کے بعد ہمارا امیج اور ہماری خیرات اس سارے گند کو دبا دے گی۔ صرف سات دن شیرو....''

الفاظ مدھم ہو رہے تھے.... کٹے کٹے سنائی دے رہے تھے۔ وہ بالکل سر جھکائے چل رہا ہے۔ وہ ہاشم کو نہیں بتا سکتا تھا کہ لاک اپ کی ایک رات نے اسے ذہنی طور پہ کتنا پیچھے دھکیل دیا تھا۔ وہ رات کی ذرا وئی سی۔ خوفناک سی۔ ہر جلد زیر ضمیر میں بہتا خون کا تالاب نظر آتا تھا۔ اور.... وہ چہرہ.... وہ نیچے گرے بوٹ کی ٹھوکروں سے زخمی لڑکے کا لہولہان چہرے کے ساتھ کہنا.... اللہ حساب لے گا....

نوشیرواں نے چہرہ اٹھایا۔ فضا میں مانوس سی خوشبو تھی۔ کافور کی سی۔ باسی گلاب کی خون آلود پتیوں کی سی مہک۔ اس نے سر اٹھایا۔

سامنے ایک دروازے کے ساتھ وہ دونوں کھڑے تھے۔ زمر اور سعدی۔ وہ دونوں چبھتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ اس کی نظریں سعدی سے ملیں۔ ان میں نفرت تھی۔ تپش تھی۔ اور ایسے زخم تھے جن کو مندمل ہونے میں صدیاں بیت جاتی ہیں۔

''میں دیکھ لوں گا تم سب کو۔'' ہاشم نے انگلی اٹھا کر تنفر سے کہا تھا۔ سعدی اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ''تم لوگوں کو بیس سال عدالت میں نہ لٹکایا تو دیکھنا۔'' اور شیرو کا منظر بدلتا گیا۔ راہداری آگے بڑھتی گئی۔ وہ دونوں خاموش کھڑے مجسمے پیچھے رہ گئے....

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ایسا ہے کہ سینے میں سلگتی ہیں خراشیں
اب سانس بھی ہم لیں گے تو اچھا نہ کریں گے

سردی کا زور ہر گزرتے دن کے ساتھ کم ہوتا جا رہا تھا۔ جیل کے احاطے پہ گرتی سنہری روشنی سلاخوں سے لپٹ لپٹ کر ان کو گرما رہی تھی۔ [illegible]

اصولاً صرف اے کلاس قیدیوں کے لئے ہونا چاہیے تھا مگر یہاں ہر طرح کے قیدی تھے اور وہ اتنے کوئی خاص پڑھے لکھے اور خاندانی نہیں لگتے تھے۔ برآمدوں میں کھڑے قطار در قطار سفید پیلے لباس والے قیدی سرگوشیاں کرتے اس نوجوان کو اندر آتے دیکھ رہے تھے۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ ان کو نہ دیکھے مگر پیشانی پسینے میں تر تھی، اور دل کی دھڑکن تیز تھی۔ اسے شدید گرمی لگ رہی تھی مگر وہ اظہار نہیں کر پا رہا تھا۔

راہداری میں سے گزرتے اس نے سلاخوں والے دروازوں کے ساتھ ٹولیوں میں کھڑے لوگوں کو چبھتی آنکھوں سے خود کو دیکھتے پایا۔

اور جانے کہاں سے وہ آواز کان میں پڑی۔

''اس نے فارس غازی کے بھانجے پہ گولی چلائی تھی۔''

نوشیرواں کے حلق میں کچھ اٹکا۔ قدم لڑکھڑائے مگر وہ چلتا رہا۔

''اس نے غازی کے بھائی اور بیوی کو مارا تھا۔''

وہ نہیں کہہ سکا کہ ایسا نہ تھا۔ کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔

مختلف راہداریوں اور برآمدوں سے گزرتے ہوئے اس نے لوگوں کی بہت سی باتیں سنیں۔ وہ اس پہ ہنس رہے تھے، غصہ کر رہے تھے، اسے غازی کا مجرم گردان رہے تھے۔ وہ اسے گالیاں دے رہے تھے۔ ماں کی۔ بہن کی۔ بیٹی کی۔ وہ اس کا تمسخر اڑا رہے تھے۔

اس کی بیرک آ گئی تھی۔

وہ صاف ستھرا کشادہ سا کمرہ تھا۔ بیڈ، صوفے، روم ہیٹر، فریج، اے سی، اٹیچ باتھ، ایل سی ڈی، ٹی وی، ڈی وی ڈی پلیئر، سب میسر تھا وہاں۔

اہلکار اس کو بستر پہ آرام کرنے کا کہہ کر اپنے مکمل تعاون کی یقین دہانی کروا رہا تھا۔ نوشیرواں سرخ پڑتی آنکھوں سے اسے دیکھتا بیڈ پہ بیٹھ گیا۔ وہ خاموش تھا۔ بالکل گونگوں کی طرح خاموش۔

ایک گالی کا برداشت کرنا انسان کو کتنی گالیوں سے بچا لیتا ہے۔ کاش وہ ایک گالی برداشت کر لیتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اے دل ذرا سی جرأت رندی سے کام لے
کتنے چراغ ٹوٹ گئے احتیاط میں

ڈاکٹر سارہ اپنے آفس میں گردن جھکائے بیٹھی، میز پہ رکھی نوٹ بک میں کچھ لکھ رہی تھی جب دروازہ ذرا سی آہٹ سے کھلا۔ سارہ نے قلم دانتوں میں دبائے آنکھیں اوپر اٹھائیں تو ٹھہر گئی۔ قلم دانتوں سے نیچے گرا۔ چہرہ ساکت ہو گیا۔

چوکھٹ میں سعدی کھڑا تھا۔ اور وہ پرانا سعدی بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ جینز کے اوپر جیکٹ پہنے، وہ آنکھوں میں چبھتی ہوئی تپش لئے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تو یہاں چھپی ہوئی ہیں آپ؟" اس کا لہجہ بھی بدلا ہوا تھا۔ سارہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ رنگت جھلک پڑی۔

"سعدی!"

"مجھے کچھ نہیں سننا۔ میں یہاں اپنی جاب واپس لینے بھی نہیں آیا۔" وہ اس پہ برہم نگاہیں جمائے چند قدم آگے آیا۔ "میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں ڈاکٹر سارہ غازی کہ آپ میرے حق میں گواہی دیں گی یا نہیں؟"

"تم مجھ سے میرا حال بھی نہیں پوچھو گے؟" اس کو دکھ ہوا۔

"نہیں، کیونکہ مجھے معلوم ہے آپ عافیت سے ہوں گی۔ یہ عافیت جو آپ نے خاموش رہنے کے عوض چنی تھی، یقیناً دیرپا ہوگی۔ میں ادھر قید میں مر رہا تھا، اس سے آپ کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سو میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ آپ.... گواہی.... دیں گی.... یا نہیں؟" وہ زور دے کر بولا۔ اتنے مہینے بعد ملاقات ہو رہی تھی اور پہلے جیسی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

"میں تمہاری طرح بہادر نہیں ہوں سعدی!"

"میں بھی بہادر نہیں ہوں۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے میں نے کتنی راتیں جاگ کر گزاری ہیں صرف خوف کے عالم میں۔ سو مجھ سے بہادری کی بات مت کیجئے۔ میں صرف یہی بتانا چاہتا تھا۔ کورٹ آپ کو بلائے گی۔ اور آپ کو آنا ہوگا۔ اگر آپ اپنی مجرمانہ خاموشی کا مداوا کرنا چاہتی ہیں تو آپ آئیں گی ورنہ میرے خاندان اور خود مجھ سے آپ کا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔"

"تم اتنے سخت دل کیسے ہو سکتے ہو سعدی!" وہ افسوس سے بولی تھی۔

وہ ایک دم تیزی سے آگے آیا۔ "میں نے.... بھروسہ کیا آپ پر.... آپ کو ایک قیمتی چیز دی۔ آپ نے اس کو بھی کھو دیا۔ آپ نے میرے لئے گواہی بھی نہ دی۔ اگر اس وقت آپ کچھ بول دیتیں تو حنین.... میرے گھر والے.... وہ اتنے ماہ ہاشم کے قریب نہ جاتے۔ اس لئے دل کی سختی کی بات مجھ سے مت کریں۔ اور فیصلہ کریں۔" ایک قہر آلود نگاہ اس پہ ڈال کر وہ باہر نکل گیا اور اپنے پیچھے دروازہ زور سے بند کر دیا۔

سارہ فکر مند سی وہیں کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پہ گزر گئی

دنیا تو لطف لے گی مرے واقعات میں

تیز دھوپ میں بینک کی عمارت جھلس رہی تھی۔ بیرونی سیڑھیاں اترتا پی کیپ سے چہرے پہ سایہ کیے کرنل خاور والٹ جیب میں ڈالتا چلا آ رہا تھا جب اس کا موبائل بجا۔ اس نے زینے اترتے اچنبھے سے موبائل نکالا پھر دھوپ کے باعث اسکرین پہ ہاتھ کا چھجا بنا کر دیکھا۔ جلتا بجھتا نمبر شناسا تھا۔ بہت شناسا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ تیزی سے فون کان سے لگاتا، مگر محتاط سا "ہیلو" کہتا کار کی طرف بڑھا۔

''خاور!''میں بول رہا ہوں!''ہاشم کی سنجیدہ آواز سنائی دی تھی۔خاور کے چہرے پہ بہت سے رنگ ابھرے....جذبات.....دکھ....مگر جب بولا تو لبوں سے بس اتنا نکلا۔

''یس سر!''

''میں جانتا ہوں تم کہاں ہو'تمہارا نمبر بھی ٹریس کروالیا ہے'لیکن.....میں کسی کو تمہیں پکڑنے نہیں بھیج رہا۔''وہ رکا۔اس کی آواز دھیمی تھی اور تاسف انگیز تھی۔

''خاور.....میں بہت اکیلا ہوں۔مجھے تمہاری ضرورت ہے۔شیرو جیل میں ہے اور چیزیں میرے ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہیں۔''

''میں جانتا ہوں سر!''وہ چلتے چلتے سایے میں کھڑی کار تک آ گیا تھا۔ایک دم جیسے سکون سا آ گیا جھلساتی دھوپ سے سائبان مل گیا ہو۔

''مجھے ہر حالت میں اس کیس کو..... یوسف خاندان کو.....کچلنا ہے۔تم میری مدد کرو گے؟ ہر بات بھلا کر۔جو میں نے تمہارے ساتھ کیا' میں جانتا ہوں تم مجرم نہیں تھے'اگر تم اس سب کو بھلا سکو تو میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ایو بیہ والے کاٹیج میں.....کل شام پانچ بجے کے قریب.....اگر تم دوبارہ میرے لئے کام کرنا چاہو تو میں انتظار کروں گا تمہارا۔''

''جو حکم سر!''خاور کی آواز بھیگ گئی۔ہاشم کی کال بند ہو چکی تھی اور وہ اس سائبان میں کتنی ہی دیر کھڑا رہا تھا۔اس کی آنکھوں میں گلابی نمی تھی مگر چہرے پہ طمانیت تھی۔سر اٹھا کر اس نے ایک تشکر آمیز نظر آسمان پہ ڈالی' پھر کار میں بیٹھا۔

کار چلانے کی بجائے وہ موبائل پہ ای میل چیک کرنے لگا۔دو دن قبل کی موصول ہوئی ای میل جسے وہ بار بار پڑھ چکا تھا' ایک دفعہ پھر کھولی۔

''میں جانتا ہوں تم میری میل ضرور پڑھو گے۔وقت تمہارے ہاتھ میں ہے خاور' چوائس تمہارے ہاتھ میں ہے۔اگر تم اپنے تمام گناہوں کا کفارہ دینا چاہتے ہو تو کاردارز کے خلاف گواہی دو۔میرے حق میں گواہی دو۔ہم تمہیں دو قتلوں کے لئے معاف کر دیں گے۔ تمہارا دامن صاف ہو جائے گا۔وقت ابھی تمہارے ہاتھ میں ہے۔

سعدی یوسف خان''

''تم سے معافی مانگی کس نے ہے؟''اس نے نفی میں سر جھٹکتے ہوئے تنفر سے کہا اور اگنیشن میں چابی گھمائی۔گاڑی میں ایک دم حرکت سی بیدار ہوئی تھی جیسے منجمد ہوئی وفا ایک لمحے میں جاگ اٹھتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ بستی ہے ستم پروردگاں کی

یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے

شام شہر کے دوسرے حصے پہ بھی ٹھنڈی سی پھیل رہی تھی۔ اس آفس میں خاصا رش تھا۔ لوگوں کی چہل پہل، کیبن کے ساتھ ٹولیوں میں کھڑے ورکرز، شور، آوازیں۔ ایک آفس کے شیشے کے دروازے بند تھے اور اندر سفاری سوٹ میں ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا، ریسیور کان سے لگائے تیز تیز پنجابی میں کچھ کہے جا رہا تھا۔ سامنے دو کرسیوں میں سے ایک پہ سعدی بیٹھا تھا۔ آگے ہو کر۔ مضطرب، بے چین۔ دوسری پہ فارس پیچھے ہو کر ٹانگ پہ ٹانگ جمائے، آرام دہ انداز میں بیٹھا، مسلسل دو انگلیوں سے کان کی لو مسل رہا تھا۔

''ہاں جی میں فائل ملتے ہی آپ کو خبر کرتا ہوں۔ اچھا جی۔'' اس نے ریسیور رکھا اور دونوں ہاتھ باہم پھنسائے آگے کو ہو کر سعدی کو مخاطب کیا۔ ''ہاں جی۔ سعدی یوسف صاحب۔ یہ شو شروع ہونے سے پہلے کا ایک گھنٹہ ہے اور اس وقت میں عموماً کسی سے ملتا نہیں، لیکن خصوصی طور پہ آپ کو بلایا ہے تو آپ سمجھ سکتے ہوں کہ اہم بات کرنی ہوگی۔'' وہ عینک اتار کر میز پہ رکھتے مصروف مگر خشک سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

''مجھے آپ کے سیکرٹری نے فون پہ کہا تھا کہ آپ میرا انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔'' سعدی نے سنجیدگی سے کہا۔ بار بار وہ فارس کو دیکھتا تھا جو بالکل خاموش بیٹھا تھا۔

''ہاں جی ایسا ہی ہے۔ دس بجے کے شو کے ٹی آر پی ز آپ جانتے ہیں کیسے آسمانوں سے بات کرتے ہیں، اوپر سے ملک کا نمبر ایک چینل ہے اور میری شکل اور ساکھ سے ملک کا بچہ بچہ واقف ہے۔''

''جیلانی صاحب، مجھے دوسرے چند چینلز سے بھی کال آئی ہے۔'' سعدی درمیان میں تیزی سے بولا۔ ''لیکن میں آپ سے ملنے اس لئے آیا ہوں کیونکہ میں اپنی کہانی صرف ایک دفعہ سنانا چاہتا ہوں اور کسی ایسے شو اور ایسے چینل پہ جہاں مجھے لگے کہ واقعی پورا ملک مجھے دیکھ اور سن رہا ہے۔''

''بالکل جی، ویسے بھی اگلے ہفتے سے قومی اسمبلی کا اجلاس شروع ہو رہا ہے، آپ کی کہانی کے لئے کسی کے پاس وقت نہیں ہوگا، بعد میں اگر کیس چلتا ہے تو عدالت میڈیا ٹرائل پہ پابندی لگا دے گی، اور آپ انٹرویو نہیں دے سکیں گے، یہی وقت ہے آپ کو اپنی کہانی بیچنی ہے۔ میرے دو شوز... ایک میں بات کور نہیں ہوتی نا۔ سو دو شوز کریں گے ہم... اس منگل اور بدھ کو... دو شوز میں آپ اسٹار بن جائیں گے۔ سوشل میڈیا سے نکل کر آپ ہر شخص کے گھر تک جا پہنچیں گے۔''

''او کے!'' سعدی نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔ پھر فارس کو دیکھا۔ وہ خاموش بے نیاز سا لگ رہا تھا۔ شاید لبوں میں کچھ چبا بھی رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ پھر تیس لاکھ جمع کرا دیں، لیکن کیش کی صورت میں۔ بینک اکاؤنٹ ڈیٹیلز میں کسی کو دیتا نہیں ہوں، مسئلے ہو جاتے ہیں بعد میں۔ یہ میرا ایڈریس ہے، آپ ادھر پیسے لے آیئے گا اسی ہفتے پھر ہم منگل اور بدھ کے دو شوز کر لیں گے۔'' کاغذ پہ پتہ لکھ کر اس نے سعدی کی طرف بڑھایا جو پلک جھپکے بنا اس کو دیکھ رہا تھا۔

''تیس لاکھ کس چیز کے؟''

''چلو جی!'' جیلانی نے اکتا کر پہلو بدلا۔ ''دیکھو بیٹا' میرے شو کا وقت ہونے والا ہے' اب فضول کی بحثوں اور جائز نا جائز کے چکروں میں پڑنے کا وقت نہیں ہے میرے پاس' نہ تو انائی ہے۔ بغیر پیسوں کے یہاں کوئی تمہیں شو میں نہیں بلائے گا' میرے جیسا اینکر تو کبھی بھی نہیں۔ اوہ بیٹا....'' پھر سمجھانے والے انداز میں کہنے لگا۔ ''اس میں کوئی غلط بات نہیں ہے' پرائم ٹائم پہ اشتہار چلوانے نا.... تیس سیکنڈ کے اشتہار کو ایک دفعہ چلوانے کی تین لاکھ سے کم فیس نہیں ہوتی۔ صرف ایک دفعہ کی بات کر رہا ہوں میں۔ یہ موبائل کمپنیاں' شیمپو والے یہ لوگ' روز کے کروڑوں کے اشتہار چلواتے ہیں۔ میں تمہیں پرائم ٹائم کے دو گھنٹے دے رہا ہوں' تیس لاکھ اس لحاظ سے کم ہیں مگر چونکہ تم نے اتنی جرات کا مظاہرہ کیا ہے' اتنا ظلم ہوا ہے تمہارے ساتھ اس لئے یہ رعائیت ہے تمہارے لئے۔ آگے تم سوچ لو۔ کاردارز کے خلاف اپنی کہانی بیان کرنے نکلو گے تو بغیر پیسوں کے کوئی اسٹوڈیو میں گھسنے بھی نہیں دے گا۔''

سعدی اٹھا' اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔ فارس دھیرے سے کھڑا ہوا' مسکرا کر جیلانی صاحب سے ہاتھ ملایا۔ ''میں اسے سمجھا دوں گا۔ ہم پیسوں کا بندوبست کر لیں گے۔ آپ شو کی تیاری رکھیں۔'' متانت سے کہہ کر وہ اس کے پیچھے آیا۔

وہ تیز تیز پارکنگ ایریا میں چلتا جا رہا تھا۔ باہر آسمان اب گہرا سیاہ ہو رہا تھا۔ اکا دکا تارے بھی ابھرنے لگے تھے۔

''سعدی!'' وہ کار تک پہنچا تو فارس تیز تیز چلتا اس سے آملا۔ ''ہم پیسے دے سکتے ہیں' ہمارے پاس ہیں پیسے!''

سعدی نے بے یقینی اور دکھ سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ''میں اس کی شکل دوبارہ تا عمر بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ اور کیوں دیں ہم پیسے؟ میں انصاف لینے اس لئے نکلا تھا تا کہ مجھے کوئی غلط کام نہ کرنا پڑے تا کہ میں قانون کا راستہ اپناؤں' فرنٹ ڈور سے اپنی منزل میں داخل ہوں۔ نہیں استعمال کرنے مجھے یہ بیک ڈورز۔'' شدتِ غم سے اس کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔ ''اور آپ وہاں بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ ایک لفظ نہیں بولے اور نہیں تو دو چار لگا تو جڑ ہی سکتے تھے اس اینکر کو۔''

''استغفر اللہ' میں شریف آدمی ہوں۔ ایسا کیوں کرتا؟'' وہ خفا ہو کر کہتا گھوم کر ڈرائیونگ ڈور کی طرف بڑھ گیا۔ سعدی اسی طرح غم و غصے سے پیچ و تاب کر رہ گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نیل کی رہگزر ہوئے' ہونٹ نہ پھر بھی تر ہوئے

کیسی عجیب پیاس تھی' کیسے عجب سحاب تھے!

اوائل مارچ کی وہ شام اپنے نیلے اندھیروں میں ڈھیروں تارے ٹانکے چھایا بنی کھڑی تھی۔ موسم سرد اور خنک تھا۔ ساکت۔ جامد۔ ہاشم کاردار خوبصورتی سے آراستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ صوفے شام کے اندھیروں جیسے نیلے تھے اور ان پہ سنہرے اجلا جلے سے کشن رکھے تھے۔ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے' گرے سوٹ میں ملبوس وہ گاہے بگاہے کلائی کی گھڑی دیکھ رہا تھا.....

باہر سڑک پہ کھڑے گردن اٹھائے اس بنگلے کی روشن کھڑکیوں کو دیکھا.....

ہاشم کاردار منتظر خاموش سا صوفے پہ بیٹھا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ وال کلاک کو بھی دیکھتا تھا۔ چہرہ سنجیدہ اور سپاٹ تھا' مگر وقت نکلا جا رہا تھا۔ جانے کتنی دیر لگے اسے آنے میں۔ وہ سوچ رہا تھا.....

سڑک پہ کھڑا خاور بہت امید سے اس گھر کو دیکھ رہا تھا۔ ذہن کے کسی نہاں خانے میں یہ خیال آیا کہ ہو سکتا ہے ہاشم اس کو صرف اس لئے دوبارہ رکھنے پہ مجبور ہوتا کہ وہ گواہی نہ دے ڈالے۔

ہاشم اب صوفے سے اٹھا اور ایک دفعہ پھر کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے ڈرائنگ روم میں ٹہلنے لگا۔ دائیں سے بائیں۔ بائیں سے دائیں.....

''نہیں!'' خاور نے دور نظر آتے بنگلے کو دیکھتے ہوئے سختی سے نفی میں سر ہلایا۔ ہاشم کو اس کی بے گناہی کا یقین آ گیا ہے۔ وہ اس کو اس کے لئے چاہتا ہے۔ وہ اس کو اس کی خدمات کے عوض واپس بلا رہا ہے۔ وہ اس کا مالک ہے۔ اور اس غلامی پہ اسے فخر ہے۔ خاور کی گردن اکڑ گئی۔ دل میں سکون سا اتر گیا.....

ڈرائنگ روم میں ٹہلتا ہاشم اب سوچتے ہوئے دو انگلیاں گال کے زخم پہ پھیر رہا تھا جہاں صبح شیو کے دوران کٹ لگا تھا۔ وہ گہری سوچ میں تھا' گویا درد کا احساس نہیں ہو رہا تھا.....

خاور سڑک پہ قدم بقدم آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ بنگلے کا آہنی گیٹ آن پہنچا۔ وہ کھلا تھا۔ کوئی ملازم' کوئی گارڈ نہ تھا' اور ایسا صرف تب ہوتا تھا جب گھر کا کوئی فرد وہاں ہوتا تھا۔ خاور ہلکا سا مسکرایا۔ اپنائیت سی محسوس ہوئی۔ اس خاندان کو وہ کتنے اچھے سے جانتا تھا۔

ہاشم ابھی تک دائیں سے بائیں چکر کاٹ رہا تھا' جب وہ رکا۔ باہر لابی سے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ بڑھتے قدم سنائی دے رہے تھے۔ ہاشم نے گہری سانس لی۔ بالآخر.....انتظار ختم ہوا.....

خاور بنگلے کے برآمدے تک آ پہنچا تھا۔ اسے اب کسی کا ڈر نہ تھا۔ ہاشم کی آواز کا وثوق' یقین' مان.....اسے اس پہ بھروسہ تھا۔ اس نے مرکزی دروازہ کھول کر دھکیلا۔ لکڑی کا پٹ چرچراتا ہوا دوسری طرف جا لگا۔ اندر روشنی تھی مگر سامنے کوئی نظر نہ آتا تھا۔ خاور سر سے اونی ٹوپی اتارتا اندر داخل ہوا.....اسی لمحے پیچھے سے اس کی گردن میں کوئی نوکیلی شے آ گڑی۔ وہ بے یقینی سے واپس پلٹا' مگر ٹرینکولائزر ڈارٹ کا اثر روشنی کی رفتار سے اس کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگا۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ گھٹنوں کے بل، بے یقین' دنگ چہرہ اٹھایا۔ تو دھندلا سا نظر آیا۔ سامنے سٹنگ روم سے کوئی چلتا آ رہا تھا.....خاور نے پلکیں جھپکائیں۔

''ہاشم!'' لبوں سے بدقت نکلا مگر وہ دیکھ سکتا تھا کہ آنے والا ہاشم نہ تھا۔

''ہیلو کرنل خاور۔ مجھے احمر شفیع کہتے ہیں۔ اور رہے ہاشم صاحب تو وہ اس وقت اسلام آباد میں ہیں.....اور ان کو اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ کسی کی دعوت [illegible] کرنے جانا ہے۔

ادھر اسلام آباد میں شہرین کے گھر کے سٹنگ ایریا میں ٹہلتا ہاشم آواز سن کر ٹھہر گیا تھا۔ دفعتاً دروازہ کھلا اور دو ملازموں کے ہمراہ شہری اور سونی آتی دکھائی دیں۔ دونوں سجی سنوری اور خوبصورت لگ رہی تھیں۔ سونی بابا کہتے ہوئے فوراً سے اس کی طرف بھاگی۔

''اتنی دیر لگا دی تم نے۔ میں کب سے انتظار کر رہا تھا۔'' وہ سونی کو اٹھا کر اس کے گال چومتا بظاہر مسکرا کر مگر درحقیقت دبے دبے غصے سے شہری سے بولا تھا۔

''میری اسٹائلسٹ کی وجہ سے دیر ہوئی ہے۔ اب چلیں۔'' وہ بے نیازی سے کہہ کر اپنا سیل فون بیگ میں ڈال رہی تھی۔ وہ سونی کو اتار کر اس کے قریب گیا۔

''آئندہ اس طرح کے دعوت نامے قبول کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھا کرو۔''

شہری نے اچنبھے سے مسکارے سے لدی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''کیوں؟''

''کیونکہ لوگ ہمارے بارے میں۔ شیرو کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ سونی کچھ سنے۔'' وہ دبی آواز میں گھرک کر بولا تھا۔

''ایسے کام کرنے سے پہلے سوچا کرو نا۔'' وہ ناک سکوڑ کر بولتی آگے بڑھ گئی۔ وہ جو کوفت زدہ کھڑا تھا سونی کے خود کو دیکھنے پہ مسکرایا اور اس کے ہمراہ دروازے کی طرف بڑھ گیا......

خاور کی آنکھ کھلی تو منظر چکراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے پلکیں جھپک جھپک کر دیکھنا چاہا مگر.... دھندلی دھندلی تھی۔ نمی سی نمی تھی۔ وہ کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ ڈکٹ ٹیپ سے۔ کہنیوں سے گھٹنوں تک سلور ٹیپ لپیٹ لپیٹ کر اس کو جکڑا گیا تھا۔ اس نے آنکھیں بار بار جھپکتے گردن جھکائی۔ سخت سردی میں وہ بغیر سوئیٹر حتیٰ کہ بغیر شرٹ کے بیٹھا تھا۔ جینز، جوتے جرابیں، سب اسی طرح پہنے ہوئے تھے مگر کندھے برہنہ نظر آتے تھے۔ اس نے پھر سے چہرہ اٹھایا۔

آج بھی سامنے..... دور..... ایک مرد اور عورت کھڑے تھے..... مگر آج وہ فوڈی ایور آفٹر کے کچن میں دشمن کے سامنے قید نہیں کھڑا تھا۔

آج مقابل اپنے تھے.....

''ہاشم!'' اس کے لبوں سے پھنسا پھنسا نکلا۔ آنکھوں میں، دل و دماغ میں ابھی بھی بے یقینی تھی۔

''ہاشم کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم کہ تم کہاں ہو خاور!'' مسکراتی ہوئی جواہرات آگے چلتی آئی۔ احمر وہیں کھڑا رہا۔ ہاتھ باندھے۔ خاموش۔

''ہاشم نے..... مجھے بلایا تھا۔''

''ہاشم نے تمہیں نہیں بلایا تھا۔'' وہ شیرنی کی سی آنکھیں اس پہ جمائے مسکرا کر بولی تھی۔ احمر قدم بقدم چلتا سامنے آیا۔

[illegible]

اور تمہارا ہی تھا۔ تم سے ہی سیکھا ہے۔ ایسے ہی بھی تم نے زمر کو بھی کال کیا تھا نا۔ کال۔ کسی اپنے کی پورے یقین سے کہی ہوئی بات پہ سب یقین کر لیتے ہیں۔ آج تم نے بھی کر لیا۔" وہ کہہ رہا تھا اور خاور.... اس کی مندی مندی آنکھیں سوچ سے مزید سکڑ رہی تھیں۔

"مارنا.... مارنا چاہتے ہو تم لوگ مجھے؟ تا کہ تم.... تم میری جگہ لے لو۔ اور آپ.... اس نے سرخ آنکھوں کا رخ جواہرات کی طرف پھیرا۔ "میں تہیہ کر چکا تھا' ہاشم کو سب بتا دوں گا۔ سعدی یوسف گواہی دے گا۔ پھر وہ مان جائے گا کہ تم نے.... جواہرات کا ردار.... تم نے مارا تھا اپنے شوہر کو۔"

جواہرات کی مسکراہٹ میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ احمر بھی سپاٹ چہرہ لئے کھڑا رہا۔

"میں سمجھ گیا تھا۔ قید میں اتنے دن رہ کر میں سمجھ گیا تھا۔ تم تھیں اس رات ان کے ساتھ۔ اور اگر تم مجھے ذہن بھر سونا بھی پیش کرو' میں تب بھی ہاشم کو ضرور بتاؤں گا اور اگر تم...." حقارت سے احمر کو دیکھا۔ "تم مجھے مار بھی دو تب بھی مجھے فخر ہے کہ میں اپنے مالک کی وفا میں جان دوں گا۔"

جواہرات نے مسکرا کر احمر کو دیکھا اور پھر باہر نکل گئی۔ احمر اس کے پیچھے آیا۔ باہر شام گہری تاریک ہو چکی تھی۔ آسمان پہ جھلملاتے ہوئے تارے افشاں کی طرح بکھرے تھے۔

برآمدے میں کھڑے جواہرات نے سنجیدگی سے اسے دیکھ کر کہا۔

"اس کو خاموش کروانا ضروری ہے۔ کر لو گے نا؟"

"آپ فکر نہ کریں' جواہرات!" اس نے سر کو خم دے کر کہا۔ پھر ملکہ کی آنکھوں پہ نظریں جمائے پورے یقین سے بولا۔ "اتنا بوجھ دل پہ لے کر نہ پھرا کریں مادام۔ اگر راز شیئر کیا ہے تو مجھ پہ بھروسہ بھی کریں۔"

"بھروسہ تھا تو بتایا ہے نا!" اس نے جھرجھری لی۔ "اب میرے سر کا تاج بہت بھاری ہوتا جا رہا ہے۔"

"میری بات سنیں دھیان سے۔" اس نے آگے بڑھ کر مضبوطی سے جواہرات کے شانوں کو تھاما۔ "اس بات سے نہ ڈریں کہ ہاشم اور نوشیرواں یہ جان جائیں گے تو کیا ہوگا؟ بلکہ اس دن کی تیاری کرنی ہے ہمیں۔ آپ نے.... ایک اچھا کام کیا تھا۔ وہ آدمی ایک درندہ تھا اور درندے کو مار کر آپ نے اپنے بیٹوں کو بچایا تھا۔ آپ نے اپنے بیٹوں کے لئے قربانی دی تھی۔"

جواہرات کی آنکھوں میں نمی در آئی۔ "وہ دونوں مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔"

"تو میں کس مرض کی دوا ہوں؟" وہ برا مان کر بولا تھا۔ "ہم مل کر اور تکذیب کا ردار کے ایسے ایسے کالے کرتوت ان کے سامنے لائیں گے' ان کے کردار کو اتنا مسخ کر دیں گے' ان کے خلاف اتنا زہر اگلیں گے کہ وہ دونوں ان سے نفرت کرنے لگ جائیں گے' اور اگر کبھی ان کو معلوم ہو بھی جاتا ہے تو وہ آپ کی پوزیشن سمجھ جائیں گے' اور یہ سوچیں گے کہ اچھا ہی ہوا' ان کو نجات دلا دی۔ آپ نے۔"

جواہرات کے لب [illegible] آنکھ سے ایک قطرہ [illegible] چھلکا۔ "کیا یہ ممکن ہے؟"

"یہ بھی تو ممکن نہیں لگتا تھا۔ آج یہ دوسری بھی ختم ہو جائے گا۔" اس نے مسکرا کر بنگلے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ مسکرا کر رہ گئی۔

جواہرات کاردار کے جانے کے بعد وہ اس تنہا پڑے بنگلے کے اندر آیا۔ کچن میں فریج سے ایک باکس نکالا اور اس کمرے میں آیا جہاں خاور بندھا پڑا تھا۔ احمر نے مصروف سے انداز میں ڈکٹ ٹیپ کا ایک بڑا ٹکڑا کاٹا۔

"اب کیا مجھے مار کر پھینکنے کا ارادہ رکھتے ہو؟ ہونہہ۔ یہ کاردار میرے نہیں ہوئے' تمہارے کیا ہوں گے۔" اس نے تنفر سے سر جھٹکا تھا۔

احمر اسی طرح آگے آیا اور ڈکٹ ٹیپ کا ٹکڑا اس کے منہ پر رکھ کر زور سے چپکا دیا۔ وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔

"میں تمہاری بک بک' تمہارے OMG's اور "کیا کیوں کیسے" نہیں سننا چاہتا' ان باتوں پہ جواب میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں' اس لئے کتنا اچھا ہو کہ تم یوں چپ ہو کر بیٹھو۔ خاموش اور بے بس! ہاں ایسے ٹھیک ہے۔" سامنے آ کر سراہتی نظروں سے اس منظر کو دیکھا' پھر واپس اپنی کرسی پہ آ بیٹھا' اور باکس کھولا۔ اندر مختلف شیشیاں' چند کاغذ اور چند سرنجیں رکھی تھیں۔

"تم نے کبھی ہیری پورٹر پڑھی ہے خاور؟ سوری' میں ایسے موقعے پہ اس داستان سے کچھ منقول کر رہا ہوں' اب جب کہ تم اپنی یہ خوبصورت زندگی کھونے والے ہو' یو نو۔" ایک سرنج کی سوئی شیشی میں چبھو کر وہ اسے اوپر اٹھائے بھر رہا تھا۔ "مگر اس میں ایک ٹرم استعمال ہوتی تھی۔ اس کا پہلا چیپٹر اسی نام سے ہے۔ The Boy Who Lived۔ وہ لڑکا جو زندہ بچ گیا۔ اور سروائیور۔" پھر نگاہیں اٹھا کر ان میں زمانوں کی تپش بھر کر خاور کو دیکھا۔ "کہتے ہیں انتقام کے سائیکل میں ہمیشہ ایک سروائیور بچ جاتا ہے اور وہ انتقام لیتا ہے' یوں چکر پہ چکر چلتا رہتا ہے..... چلتا رہتا ہے..... میں..... کرنل خاور..... میں ہوں وہ لڑکا جو بچ گیا تھا!"

خاور کا منہ ٹیپ سے بند تھا مگر کھلی آنکھوں میں اچنبھے اور حیرت کے سارے الفاظ سمٹ آئے تھے۔

"وہ بریگیڈیئر یاد ہے تمہیں کرنل خاور جس کو اس کے پورے خاندان سمیت تم نے قتل کیا تھا؟ تمہیں شک تھا کہ امریکہ میں اس کی ایک اور اولاد بھی ہے' کسی دوسری عورت سے جسے وہ چھپا کر رکھتا ہے' اور تمہیں یقین تھا کہ وہ بیٹی ہو گی' مگر تم غلط تھے۔ وہ بیٹا تھا۔ سلطان بخش۔ اور وہ میں تھا!" اس نے شیشی سرنج کی سوئی سے نکالی' جھک کر کاغذ سے کچھ پڑھا' پھر دوسری شیشی اوپر اٹھا کر' سوئی اس میں گھسا کر احتیاط سے مائع سا سرنج کے بطن میں بھرنے لگا۔

خاور کی آنکھیں پھیل گئی تھیں' اور وجود بالکل ساکت ہو گیا تھا۔

"جب تم نے میرے باپ اور میری ہاف فیملی کو قتل کیا تھا تو میں ایک ٹین ایج لڑکا تھا جو بورڈنگ اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ میرا باپ اپنی حساس جاب کے باعث اپنی اولاد اور خاندان والوں کے ویئر اباؤٹس مخفی رکھتا تھا' لیکن تم اس رات ہمارے گھر گئے جب سب وہاں موجود تھے' چھٹیوں پہ سب آئے ہوئے تھے۔ میں نہیں تھا۔ سو میں بچ گیا۔ ابا کے رشتے داروں نے ساری پراپرٹی ہتھیالی' اور ابا کے دوستوں نے مجھے واپس آنے سے روک دیا۔ وہ کہتے تھے سلطان' تم بھاگ جاؤ' چھپ جاؤ۔ وہ آدمی تمہیں ڈھونڈ رہا ہے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ آدمی کون تھا۔ [illegible] سے چھپتا رہا۔ [illegible] اسکول [illegible] بدلا [illegible]

بدل نے مجھے اتنا تنفیع بنا دیا۔ Con Man۔'' وہ احتیاط سے شیشی اوپر اٹھائے قطرہ قطرہ اٹھائے سرنج میں بھر رہا تھا۔ نظریں اوپر سرنج کے بھرتے پیٹ پہ جمی تھیں۔

خاور کا چہرہ سرخ تھا' آنکھوں میں خون اتر آیا تھا' وہ سختی سے نفی میں سر ہلاتا خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا' مگر گرفت مضبوط تھی۔

''برسوں کی محنت اور کھوج نے مجھے اتنا بتا دیا کہ ساری گتھیاں اورنگزیب کاردار کے گرد جا کر کھلتی ہیں۔ میں نے خون کو ان سے متعارف کروایا' ایسے کہ وہ مجھے ملازمت کی پیشکش کریں۔ Con Man کبھی کچھ نہیں مانگتا' وہ ایسے مواقع پیدا کرتا ہے کہ آپ کو لگے' یہ سب آپ کا ہی آئیڈیا تھا۔ وہ خود ہی مجھے سب دیتے گئے۔ اور ان کے پاس اتنا عرصہ کام کر کے جانتے ہو مجھے کیا معلوم ہوا؟ وہ سب جو تمہیں خود نہیں معلوم!''

شیشی رکھی' کیس بند کیا' اور سرنج پکڑے' اسٹول اٹھائے اس کے سامنے آ کر اسٹول رکھا' اور اس پہ بیٹھا۔ پھر اس کی خون آشام آنکھوں میں دیکھ کر سادگی سے بولا۔

''تم نے ہاشم کے کہنے پہ زمر یوسف کو زخمی کیا' اس سے اس کے تمام رشتے چھینے' اس کی شادی کینسل کروائی' اس کا ہر راستہ بند کیا۔ ایسے یہ ہر راستہ بند کرنے والا کام.... یہ کاردارز نے پہلی دفعہ زمر کے ساتھ نہیں کیا تھا۔ چند برس پہلے جب جواہرات کاردار اور ہاشم کاردار کے سیکیورٹی ہیڈ کا انتقال ہوا تھا تو انہوں نے سوچا' یوں ہی ایک نیا سیکیورٹی ہیڈ ڈھونڈا جائے؟ پھر اسے تراشا جائے۔ پھر اس کا ہر راستہ بند کیا جائے تاکہ وہ ان ہی کا ہو کر رہ جائے؟'' اس کی آنکھوں میں دیکھ کر وہ چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔ خاور کا مزاحمت کرتا وجود ٹھہر گیا۔ ساکت۔ ساکن۔

''یہ بڑے لوگ ایسی بڑی بڑی پوسٹیں دینے سے پہلے امیدوار کا ہر راستہ' ہر دروازہ بند کرتے ہیں۔ انہوں نے آٹھ ماہ تم پہ انویسٹ کیا۔ ایک بہادر' دلیر اور زیرک کرنل پہ الزام لگوایا' پھر اسی کے مدعی بن کر' وکیل بن کر اس کو عدالت سے چھڑوایا' اور پھر....'' اس کی آواز یاسیت سے دھیمی ہوئی۔ خاور سکتے میں تھا۔ ''اور پھر ہاشم کاردار اور جواہرات کاردار نے تمہارے بیٹوں کو مروایا' کیونکہ تم بری ہونے کے بعد ملک سے باہر جانے کا سوچنے لگے تھے۔ یہ کافی نہیں تھا۔ ان کو ایک وفادار آدمی چاہیے تھا۔ جس کا کوئی نہ رہے اور ان کا ہو کر رہے۔ اور الزام ڈالا انہوں نے میرے باپ پہ۔ کرنل خاور' میرا باپ ایک ایماندار اور اچھا آدمی تھا۔ وہ تمہیں گرفتار ضرور کرنا چاہتا تھا مگر اس نے تمہارے بیٹوں کو نہیں مارا تھا۔ ان کو جواہرات کاردار نے مروایا تھا۔ یہ سارے مافیا باسز' یہ ایسے ہی ڈھونڈتے اور تراشتے ہیں اپنا دایاں ہاتھ۔ انہوں نے تمہیں تراشا اور جب تم نے اپنی زندگی کے پہلے قتل کر ڈالے تو وہ تمہاری سب سے بڑی سپورٹ بن کر سامنے آ گئے۔ انہوں نے تمہیں اپنی چھایا تلے لے لیا۔ اور تم ان کے کہنے پہ ساری زندگی دوسروں کو قتل کرتے آئے' زندگیاں برباد کرتے آئے۔ ان کے کہنے پہ جنہوں نے تمہارے بچوں کو مروایا تھا۔ اور یقیناً ان کے پاس اس عمل کی بھی جسٹی فکیشن ہو گی۔ تم حیران تھے نا کہ ہاشم نے کیوں یقین کر لیا کہ تم نے اور [illegible] کاردار [illegible] ان کی حقیقت جان [illegible] کو [illegible]

وہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ تم کیا جانتے ہو۔ جن اپنی باتوں کا کوئی ثبوت تمہیں نہ بھی ملا‘ تب بھی جب ان کو سوچو گے تو خود ہی ساری کڑیاں ملتی جائیں گی۔ سب واضح ہو جائے گا۔‘‘ احمر اسٹول سے اٹھ کھڑا ہوا۔

خاور اسی طرح سکتے کے عالم میں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مگر وہ نیچے ٹپک نہیں رہے تھے۔ وہ بھی ساکت تھے۔

احمر اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا تھا۔

’’تمہارے پاس چوائس تھی‘ تم ہاشم کے پاس واپس آنے کی بجائے عدالت چلے جاتے‘ اس کے خلاف گواہی دیتے‘ لیکن تم نے وہی کیا جو تمہاری خصلت تھی۔ اگر تمہارے اندر کوئی خیر ہوتی تو میں تمہیں چھوڑ دیتا تو تم خود بھی اس رات فوڈ لی ایور آفٹر کے کچن میں اس عورت پہ پستول تانتے جس نے فارس کو ٹھنڈا کر کے تمہاری جان بچائی تھی۔ مگر وہ کیا ہے خاور کہ میں ان جیسا نہیں ہوں۔ نہ میں تمہارے جیسا ہوں۔ میں وہ نہیں کروں گا جو تم سمجھ رہے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کرنے جا رہا ہوں۔ ایک تیز‘ بنا درد کے موت؟ کیا تمہیں واقعی لگتا ہے اتنا رحم میں تمہارے اوپر کھاؤں گا!‘‘

اور خاور کو محسوس ہوا کہ اس کے برہنہ کندھوں پہ احمر شفیع نے گلوز والے ہاتھ رکھے ہیں‘ اور پھر.... گردن کے نیچے.... قدرے نیچے.... سوئی کی نوک چبھی.... درد.... تکلیف.... اور پھر.... جیسے ہر شے راکھ کا ڈھیر بن گئی۔

یہ وہ دن تھا جب کرنل خاور مظاہر حیات کی زندگی کا باب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

★★★★★★★★★★

دلوں کی روشنی بجھنے نہ دینا

وجودِ تیرگی محکم نہیں ہے

سبز بیلوں سے ڈھکے مورچال کی بالائی منزل کی کھڑکیوں سے مارچ کی ٹھنڈی دھوپ سیدھی ٹکرا رہی تھی۔ اندر جھانکو تو کمرے ٹھنڈے لگتے تھے۔ ایسے میں حنین کا کمرہ عجیب نمونہ پیش کر رہا تھا۔ فرنیچر جو دیواروں سے لگا تھا‘ ذرا آگے کھسکا کر چادروں سے ڈھک دیا تھا‘ اور کونے میں ایک چھوٹی سیڑھی سی رکھی تھی۔ فرش پہ نیچے ایک بڑی بالٹی‘ ایک اور دو پینٹ کے ڈبے رکھے تھے۔ وہ خود عام شلوار قمیض پہنے‘ بالوں کو کشمیری انداز میں اسکارف میں لپیٹے‘ آستین پیچھے چڑھائے سیڑھی کے اوپر کھڑی تھی اور سوکھے برش کو بازو اونچا کر کے چھت سے ٹکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

’’میرا ہاتھ جا رہا ہے‘ میں دیوار کے اوپری کونے تک پینٹ کر لوں گی۔‘‘ اس نے چہک کر اطلاع دی۔ نیچے فرش پہ آلتی پالتی کیے بیٹھے اسامہ نے بہت ضبط سے کھنکار کر اس کی توجہ لی۔

’’حنہ! یہ تم کل شام کیا اچانک سے ریسٹورانٹ کے بچے ہوئے ڈبے لے آئی ہو اور اب کہہ رہی ہو کہ تم نے پینٹ کرانا ہے کمرہ۔‘‘

پتہ ہے ان کے کمرے اتنے خوبصورت کیوں ہوتے ہیں؟ کیونکہ ان میں یہ سفید چونا پینٹ نہیں ہوتا۔ گورے ہمیشہ اپنی دیواروں کو Tint ضرور دیتے ہیں۔ دروازے وہ سفید رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں الٹا حساب ہے۔" ناک سکوڑ کر وہ واپس دیوار کی طرف متوجہ ہوئی۔

"مگر حنہ یاد ہے جب ریسٹورانٹ پینٹ ہوا تھا؟ وہ لوگ ایسے ہی منہ اٹھا کر پینٹ نہیں کر لیتے تھے' بلکہ پہلے دیوار پہ کچھ رگڑتے تھے اور بھی بہت کچھ کرتے تھے۔ تم نیٹ پہ پینٹ کے ٹیوٹوریل کیوں نہیں پڑھ لیتی؟" سیم نے ہار نہیں مانی تھی۔

"میں نے کوشش کی تھی' وہ اتنے لمبے چوڑے اسباق دہرا رہے تھے' میں نے چھوڑ دیئے' ایویں گوروں کے نخرے' یہ کرو وہ کرو۔ اس طرح تو بندہ سال بھر کمرہ ہی تیار کرتا رہے۔ پینٹ کب کرے؟" پھر لاپرواہی سے سر جھٹکا۔ "میں تو ایسے ہی کروں گی پینٹ۔ یہ کون سا مشکل ہے۔ بس برش کو پینٹ میں ڈبو کر دیوار پہ اوپر نیچے لگاتے جاؤ۔ واؤ۔" آنکھیں میچ کر اس نے وہ کارٹون یاد کیے جن میں یونہی مزے سے پینٹ ہو جاتا تھا۔ "اور پھر دیکھنا' کتنا خوبصورت رنگ چڑھے گا۔"

"مگر کیا وہ رنگ دیرپا بھی ہوگا؟" چوکھٹ میں قدموں کی آواز آئی اور پھر اس کی آواز۔ حنین وہیں ٹھہر گئی۔ برش والا ہاتھ نیچے گرا دیا۔ مڑی نہیں۔ ساکت کھڑی رہی۔ اسامہ جو نیچے بیٹھا تھا' وہ بھی نہیں ہلا' بس سر جھکا دیا۔ وہ سعدی سے ابھی تک نظریں نہیں ملا سکتا تھا۔

"گورے ایک بہت اچھی' بہت قابل قوم ہیں اور جب وہ کہتے ہیں کہ یوں منہ اٹھا کر پینٹ نہیں کرتے تو وہ صحیح کہتے ہیں۔ وہ ہماری طرح سست اور کام چور نہیں ہوتے۔ اپنا ہر کام خود کرتے اور احسن طریقے سے کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔" وہ گردن اٹھائے حنین کے کمرے کی دیواروں کو دیکھتا دھیمے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اسامہ اور حنین اپنی جگہ چپ تھے۔ ساکت۔ جامد۔

"خوبصورت رنگ ایسے نہیں چڑھ جاتے۔ ان کے لئے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ جان مارنی پڑتی ہے۔ ایک ایک بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے یہ دیواریں.... یہ گھر کی دیواریں اپنے اوپر کسی اجنبی رنگ کو ایسے ہی نہیں چڑھنے کی اجازت دے دیتیں۔" وہ ہنوز گردن اونچی کیے سادگی اور نرمی سے کہہ رہا تھا۔ اس کی طرف کمر کیے او نچائی پہ کھڑی حنین کی آنکھوں کے کٹورے لبالب بھرتے گئے۔ مگر لب ایک دوسرے میں سختی سے پیوست کر کے ضبط کیا۔ سیم کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔

"دوسری کسی بھی چیز کو رگڑو تو وہ خراب ہوتی ہے' اس کی چمک اور خوبصورتی ماند پڑ جاتی ہے۔ مگر دیواروں کی نہیں۔ گھر کی دیواروں کو رگڑیں کھانی پڑتی ہیں۔ سخت ریگ مال سے ان کو رگڑ رگڑ کر چھلنی کیا جاتا ہے' مگر یہ ہر رگڑ کے بعد پہلے سے زیادہ smooth ہو جاتی ہیں' پھر ان کے سوراخ اور دراڑیں بھری جاتی ہیں۔ فلر سے ان کے زخموں کو مرہم لگایا جاتا ہے۔"

حنین نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنسو ٹپ ٹپ گرتے چلے جا رہے تھے۔ سیم سر جھکائے ہولے ہولے سسک رہا تھا۔ چوکھٹ میں کھڑا لڑکا جس کے بال اب پہلے جیسے چھوٹے نہ رہے تھے' اور قدرے بڑھنے کے باعث ان کا اصل قدرتی گھنگریالا پن نظر آنے لگا تھا' اسی طرح ملائمت سے بول رہا تھا۔

پھر ان کے اوپر پرائمر (primer) پینٹ کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں اسے ڈسٹمپر یا چونا وغیرہ بھی کہتے ہیں۔ گورے اس کو پرائمر یا seder کہتے ہیں۔ وہ ساری دیوار کو ڈھانک لیتا ہے۔ اس کا پردہ بن جاتا ہے۔ سارے عیوب ڈھک جاتے ہیں پرانے پینٹ اور نئے پینٹ کے درمیان کی آڑ ہوتا ہے وہ۔ ماضی کو مستقبل پہ اثر انداز ہونے سے روک دیتا ہے۔''

اونچی سیڑھی پہ کھڑی حنہ نے گردن جھکا دی۔ ہاتھ اسی طرف دیوار پہ جما تھا اور آنسو ٹپ ٹپ گرتے جا رہے تھے۔

''وہ پرائمر پینٹ اگر نہ لگایا جائے تو نئے آنے والے ہر پینٹ کو دیوار کے پلستر کی دیوار اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اس مستقبل کے ہر رنگ کو ماضی کے سوراخ کھا جاتے ہیں۔ لیکن اچھے سے پرائمر لگا دو تو اوپر جو رنگ بھی کرو.... وہ ایسا خوبصورت چڑھے گا کہ سارا گھر چمک اٹھے گا۔ پھر زمین سے رس رس کر خراب چور دراڑوں سے داخل ہوتے پانی سے بھی دیواریں خراب نہیں ہوں گی' نہ موسم اثر کرے گا' نہ کسی کا میلا ہاتھ گدلا کر سکے گا اس رنگ کو۔ گھر کی دیواروں کے ایسے پکے اور خوبصورت رنگ یونہی نہیں آ جاتے۔ ان کے لئے بنیاد کو ایک دفعہ تو چھلنی کرنا پڑتا ہے۔''

حنین نے برش کہاں گرایا' وہ کیسے سیڑھی سے جست لگا کر اتری' اسے نہیں علم۔ بس وہ روتی ہوئی دوڑتی ہوئی آئی اور سعدی کے گلے لگ گئی۔

''بھائی' آئی ایم سو سوری۔ آپ کا قصور نہیں تھا۔ بھائی آئی ایم سو سوری۔''

سیم بھی ایک دم اٹھا اور بھاگ کر ان دونوں کے گرد بازو حمائل کیے سعدی کے کندھے سے لگ گیا۔ وہ بھی رو رہا تھا۔

''بھائی میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ پلیز آپ دوبارہ مت جانا۔''

وہ دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے جن کے صرف قد بڑے ہو گئے تھے۔ سعدی ان دونوں سے اونچا تھا' اس کے بازو دونوں سے زیادہ مضبوط تھے۔ وہ دونوں کے گرد بازو حمائل کیے' بیک وقت دونوں کو تھپک رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ نرمی' آنکھوں میں نمی اور لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔

''مجھے بھی تم سے لڑنا نہیں چاہیے تھا۔ ایک غلطی کے پیچھے مجھے یہ نہیں بھولنا چاہیے تھا کہ جہاں کتنے لوگ بزدلی سے میرے معاملے سے جان بچا کر نکل گئے اور کتنے لوگ صرف لالچ میں میرا ساتھ دینا چاہتے ہیں' وہاں اتنے ماہ تم لوگ میرے لئے کھڑے تھے!''

مگر وہ دونوں اس کو بولنے نہیں دے رہے تھے۔ حنین روتے ہوئے نفی میں سر ہلاتی بولے جا رہی تھی اور سیم اس کے کندھے پہ ماتھا ٹیکے ہچکیوں کے دوران کہہ رہا تھا.....

''بھائی آپ کا حق تھا مجھ سے لڑنے کا۔ میں نے غلط کیا تھا۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ سب سے زیادہ سفر (suffer) آپ نے کیا تھا۔''

بھائی [illegible]

ہوا وہ ہماری برابر کی بہن ہے۔ مجھے درمیان میں نہیں آنا چاہیے تھا۔" اور سیم سب بچوں کی طرح بلکتے بہہ رہا تھا۔ وہ اس کا سر تھپکتے تھپکتے ہنس دیا تھا مگر حنین نے تو جیسے سنا ہی نہیں تھا۔

''ہم نے بھی اتنا نہیں سوچا کہ آپ کو اتنے ماہ خوشی کا ایک لمحہ بھی نہیں ملا۔ ہمارے پاس تو پھر بھی خوشی کے پل بیٹھنے کے لیے آئے تھے' مگر آپ نے سفر کیا سب سے زیادہ۔"

''اور میں یوں بولا بھائی جیسے آپ کسی لگژری ٹرپ سے لوٹے ہیں۔ مجھے یوں نہیں...' وہ تینوں ایک دوسرے کے ساتھ لگے نیچے بیٹھے گئے تھے۔ وہ ''کوئی بات نہیں۔ آئندہ ہم ان باتوں کو اپنے درمیان نہیں آنے دیں گے'' بار بار یہی بات دہراتا جا رہا تھا' کبھی جھک کر حنہ کا ماتھا چومتا' کبھی سیم کے بال سہلاتا۔ وہ بڑا تھا۔ اسے ہی تسلی دینی تھی۔ اسے ہی زیادہ ظرف کا مظاہرہ کرنا تھا۔ بڑوں کی قربانیاں بھی بڑی ہونی چاہئیں نا۔

مورچال کے باہر دھوپ ڈھلتی گئی یہاں تک کہ بنگلے پہ چھایا سی تن گئی۔ اب حنہ کی کھڑکی سے جھانکو تو وہ تینوں چوکڑی مارے فرش پہ بیٹھے تھے۔ درمیان میں کوک سے بھرے تین گلاس' کوک کی بڑی بوتل اور چند ڈبے کھلے پڑے تھے جن میں سے برگر اور فرنچ فرائیز جھلک رہے تھے۔ سعدی سر جھکائے کوک کے گلاس میں اسٹرا ہلاتا دھیرے دھیرے سے بول رہا تھا' اور وہ دونوں کھاتے ہوئے سن رہے تھے۔

''ہاشم سمجھا ہم باہر پڑا پرائے ہجوم میں گم ہونے والے ہیں سو اس کے سارے بندے اسی طرف بھاگے مگر ہم ایک باتھ روم کے نیچے مین ہول سے سرنگ میں اترے۔ اور وہاں سے.....'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''سیدھا بار دوگلیاں چھوڑ کر سڑک پہ نکل آئے۔'' سر جھکائے بولتے اس کے چہرے پہ یاسیت تھی۔

''واؤ!'' سیم برگر کا بھاری نوالہ منہ میں چباتا آنکھیں پھیلا کر بولا تو حنین نے آنکھیں دکھائیں۔ (موٹے آلو چپ کرو وہ تمہیں تکلیف دہ واقعے کا منظر نامہ بتا رہا ہے' کسی ایڈوانچر کا نہیں۔) سیم نے جلدی سے نوالہ نگلتے ہوئے چہرے پہ مسکینیت طاری کی۔ ''اوہ!'' سعدی اس کے بدلے انداز پہ نرمی سے مسکرا دیا اور کہنے لگا۔

''پھر ہم وہاں سے ایک ٹک ٹک میں بیٹھے اور.....''

''پتہ ہے بھائی' کتنا اچھا ہوتا اگر آپ سنز کار دار کو یرغمال بنا کر ساتھ لے آتے۔ چوبیں گھنٹے بعد جو میک اپ اترنے سے ان کی حالت ہوتی....'' حنہ خود بھی نہ رہ سکی۔ بول کر ہنستی چلی گئی۔ سعدی نے ہاتھ اٹھا کر اس کے سر پہ ہلکا سا تھپڑ لگایا۔

''یوں کرو تم بول لو میری خیر ہے۔''

''اللہ! میں نے کیا کیا ہے!''

اور زمر جب سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی تو اس نے دیکھا وہ تینوں اسی طرح ایک ساتھ بیٹھے برگر کھا رہے تھے اور ایک دوسرے کو ...
دے رہے تھے۔ چہروں پہ ... آنسوؤں کے نشان ابھی بھی موجود تھے اور لبوں سے مسکراہٹیں پھوٹ رہی تھیں۔

''سعدی!'' زمر نے دھیرے سے دروازے پہ دستک دی۔ تینوں نے سر گھما کر دیکھا۔ حنہ نے فوراً گریڈ ھایا مگر وہ مسکرا کر لڑکی میں سر ہلاتی کام کی بات پوچھنے لگی ''انٹرویو کا کیا بنا؟ فارس نے کچھ بتایا ہی نہیں۔''

''انٹرویو۔ ہو تو ہے۔'' سعدی نے سر جھکایا۔ ''تیس لاکھ مانگ رہا تھا وہ اینکر۔ اور فارس ماموں کو دیکھیں' خود کہا تھا کہ تمہارے ساتھ چلوں گا' مگر وہاں جا کر بالکل چپ بیٹھے رہے' اتنا نہیں ہوا کہ دو تھپڑ لگا دیتے اس اینکر کو۔ ایک مارنے کا کام ہی تو آتا ہے ان کو' وہ بھی نہیں کیا۔'' خفگی سے واپس گردن موڑلی۔ زمر اور حنین نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر حنہ کھنکھاری۔ ''بھائی.... فارس ماموں چپ ہوں تب بھی بہت کچھ کر جاتے ہیں۔ ان کو ہلکا نہ لیں۔''

''بالکل۔'' زمر مسکراہٹ چھپاتی واپس چلی گئی۔ نیچے آئی تو وہ کچن میں بیٹھا تھا۔ موبائل پہ بٹن دبا رہا تھا۔

''مجھے تم سے بات کرنی ہے فارس۔'' اس نے کرسی کھینچی تو فارس نے نظریں اٹھائیں۔ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

''زہے نصیب۔ آپ کو میرا نام بھی یاد ہے!''

''تھوڑا بہت تو یاد ہے۔'' وہ ہنس دی۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''سعدی کا انٹرویو ہونا ضروری ہے' وہ اس کے لئے بہت اپ سیٹ ہے اور.....''

''ہو جائے گا انٹرویو۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔ انداز میں لاپروائی تھی۔

''مگر کیسے؟'' زمر نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

''پیسے دیں گے اور کیا۔ مگر اس کے لئے سعدی راضی نہیں ہے سو دعا کریں گے۔ کوئی اور حل ہے تو بتائیں مجھے۔''

وہ چپ ہو گئی۔ ''مگر.... کوئی اور طریقہ نہیں ہے کیا؟'' محتاط سے انداز میں پوچھا۔

''کیوں پراسیکیوٹر صاحبہ' قانون پہ یقین ہے نا آپ کو تو بس میں نے بھی تہیہ کر لیا ہے' کہ اب قانون نہیں توڑنا اور شریف آدمی بن کر رہنا ہے۔ ایسے مشکوک نظروں سے کیا دیکھ رہی ہیں مجھے؟ سچ کہہ رہا ہوں۔'' وہ خفگی سے کہتا باہر کی جانب بڑھ گیا۔ زمر سوچتی نظروں سے اسے جاتے دیکھے گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

چند دن بعد

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

چاک دامن تو خیر سل جاتا

چاکِ ہستی کہاں رفو کرتے

[illegible]

رسیدہ درختوں پہ نئے شگوفے اور پتے کھلنے لگے تھے۔ چبوترے کے سامنے پراسیکیوشن کے بینچ پہ زمر بیٹھی، قلم انگلیوں میں گھماتی بغور کٹہرے میں کھڑے نوشیرواں کو دیکھ رہی تھی۔ دوسری میز پہ ٹیک لگا کر آرام دہ انداز میں بیٹھے ہاشم کاردار کی سنجیدہ نظریں بھی وہیں جمی تھیں۔

عزت مآب اختر مرتضیٰ صاحب بھی اسی سے مخاطب تھے اور کرسی کا رخ ذرا ترچھا کیے، کاغذ سے پڑھ کر اسے چارجز سنا رہے تھے۔ وہ کٹہرے کے جنگلے پہ ہاتھ رکھے کھڑا سپاٹ سا نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پہ زخموں کے تازہ نشان تھے اور ایک آنکھ نیلوں نیل تھی۔

''کیا آپ نے تمام چارجز سن اور سمجھ لیے؟''

''جی یور آنر!''

''کیا آپ نوشیرواں کاردار، اکیس مئی 2015 کی شام پلاٹ نمبر پندرہ میں سعدی یوسف سے ملنے گئے تھے اور آپ نے ان پہ تین گولیاں چلائیں۔ پھر بوٹ کی ٹھوکروں سے ان کو زخمی بھی کیا؟''

زمر کے ساتھ بیٹھے سعدی کی چبھتی نظریں شیرو کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ نوشیرواں نے نگاہیں اٹھا کر حاضرین کو دیکھا اور پھر بلند آواز میں بولا۔ ''یہ غلط ہے۔ میں اس روز دبئی میں تھا۔''

''کیا آپ تمام الزامات سے انکار کرتے ہیں؟''

''جی میں انکار کرتا ہوں۔ مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ میں بے گناہ ہوں۔'' وہ میکانکی انداز میں نیچے بیٹھے ہاشم کو دیکھ کر بولا تھا۔

''کیا آپ innocent plead کرتے ہیں۔''

''جی میں انوسینٹ پلیڈ کرتا ہوں۔''

(اس موقع پہ اگر ملزم صحتِ جرم کا اقرار کر لے تو اس کے خلاف فیصلہ سنا دیا جاتا ہے اور اسی وقت سزا بتا دی جاتی ہے۔ اگر وہ انکار کرے تو اسے شفاف مقدمے کا حق دیا جاتا ہے جہاں وہ استغاثہ (الزام لگانے والوں) کے ثبوت و شواہد کا دفاع اپنے وکیل کے ذریعے کرے۔)

''او کے۔ آپ کو فیئر ٹرائل کا حق دیا جاتا ہے۔ کیا آپ اپنے خلاف گواہ بننا چاہیں گے۔'' نیچے بیٹھے ہاشم نے نفی میں سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ نظریں شیرو پہ تھیں۔

''نہیں یور آنر۔ میں خاموشی اختیار کروں گا۔'' اس نے اسی انداز میں کہا تھا۔

چند منٹ بعد باہر راہداری میں زمر اور سعدی چلتے جا رہے تھے اور جب وہ بہت دل گرفتہ سا بولا تھا۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا جج نے کیس [illegible] خوبصورتی [illegible] وہ ... گھر چلا جائے گا [illegible] باہر۔''

زمر نے نگاہیں پھیر کر اسے دیکھا۔ یوں لگتا تھا وہ برسوں پہلے یونیورسٹی کے موٹ کورٹ سے نکلے تھے اور وہ میری کے خلاف فیصلہ آنے پہ شدید تلملا رہا تھا۔

''سعدی.....اس کو جیل میں پیٹا گیا ہے' اس کی جان کو خطرہ ہے' جج کو اسے جیل سے نکالنا ہی تھا۔''

''ہاشم نے اسے خود پٹوایا ہے۔ مجھے یقین ہے۔''

''ظاہر ہے ہاشم نے اسے پٹوایا ہے' سماعت سے پچھلی رات۔ مگر ہم یہ باتیں جج کو کہیں گے تو ہم خود ہی جھوٹے لگیں گے۔ اس کی ضمانت ہونی ہی تھی۔'' وہ اسے تسلی دے رہی تھی۔

''اگلے ماہ کی تاریخ ملی ہے۔ کیسا نظام ہے یہ۔ ہم کتنا انتظار کریں گے۔ وہ تاریخ پہ تاریخ دیتے جائیں گے۔ زمر ایسے تو کبھی انصاف نہیں ملے گا۔'' وہ شدید تکلیف میں لگ رہا تھا۔ زمر یک ٹک اس کی زخمی نظروں کو دیکھے گئی۔

''یہ معاملات لمبے چلتے ہیں سعدی۔ کوئی بات نہیں' ہم لڑتے رہیں گے۔''

''مجھے نہیں پتہ۔'' وہ سر جھٹک کر خفا خفا سا چلتا گیا۔ زمر کے اندر کچھ ڈوب گیا تھا۔ وہ بار بار اس پہ ایک فکرمند متحیر سی نظر ڈالتی تھی۔ حنین اور اسامہ کا بھائی گھر آ گیا تھا' پہلے جیسا تو نہ تھا' مگر کیا سعدی یوسف گھر آ گیا تھا؟ وہ کیا کرے؟ اور کیا وہ کبھی گھر آ پائے گا؟ اسے یقین نہیں رہا تھا۔

★★★★★★★★★★★★

ایک تو خواب لیے پھرتے ہو گلیوں گلیوں
اس پہ تکرار بھی کرتے ہو خریدار کے ساتھ

ہارون عبید کی رہائش گاہ پہ وہ دوپہر سردی تپش لئے سارے کو جھلسا رہی تھی۔ سبزہ زار کی طرف کھلتی کھڑکی سے اندر جھانکو تو اپنے کلینک میں آبدار مخصوص کرسی پہ بیٹھی نوٹ پیڈ پہ کچھ لکھ رہی تھی۔ کھڑکی کی طرف اس کی کرسی کی پشت تھی اور یہاں سے اس کا نیم رخ دکھائی دیتا تھا۔ سرخ رومال میں بندھے بال' جھکی آنکھیں' زرد رنگت' سوکھے ہونٹ۔ وہ اداسی سے سر جھکائے لکھتی جا رہی تھی جب دروازہ کھلا۔

''میں آج مزید کلائنٹس نہیں.....'' اکتا کر بولتے اس نے نظریں اٹھائیں تو رک گئی۔ یہاں سے دکھائی دیتے آدھے چہرے پہ واضح حیرانی ابھری۔

''بابا! خیریت؟'' سامنے چوکھٹ میں ہارون کھڑے تھے۔ کلف لگے شلوار سوٹ میں ملبوس' وہ مطمئن نظریں اس پہ جمائے' ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ آگے آئے۔ ''تم ٹھیک ہو آبی؟''

آبی نے کرسی پہ پیچھے کو ٹیک لگائی تو اب اس کا چہرہ زیادہ واضح ہوا۔ اس پہ اداس مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔ ''جی۔ آپ نے وعدہ کیا تھا' اس لئے اب ٹھیک ہوں۔''

''اوکے۔ تمہیں ایک کام کرنا ہے اب۔'' وہ سامنے کرسی پہ براجمان ہوتے سادگی سے بولے تھے۔ آبدار کے ابرو اکٹھے ہوئے۔ ''جی؟ کیا؟''

''ہاشم نے نوشیرواں کی ضمانت کروالی ہے۔ اب وہ ٹرائل کو لٹکائے گا' تاریخ پہ تاریخ لیتا جائے گا۔ یوں فیصلہ نہیں آئے گا۔ تم نے صرف اس کو کنوینس کرنا ہے کہ وہ اس کیس کو جلد انجام تک پہنچانے پہ رضامند ہو جائے۔''

''مگر بابا' اس نے مجھے پرپوز کیا تھا' میں اس دن سے اس کی کالز نہیں اٹھا رہی' اس کو اگنور کر رہی ہوں تاکہ وہ مجھ پہ دباؤ نہ ڈالے۔ اب میں کیسے اس کے پاس جا کر.....''

''یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ تم اس کو کچھ بھی کہو۔ مگر اس کو راضی کرو۔ تم چاہو تو کہہ دینا کہ اس پرپوزل پہ تم صرف تب غور کرو گی جب وہ اور اس کا خاندان تمام الزامات سے بری ہو جائے گا۔''

''بابا!'' اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔ ''میں اس پرپوزل پہ غور نہیں کروں گی۔ پھر میں اسے جھوٹی امید کیوں دلاؤں؟''

''بعد میں جو ہو گا وہ میں سنبھال لوں گا۔ ابھی کے لیے تمہیں اس کو راضی کرنا ہے۔'' وہ زور دے کر بولے۔ آبدار کے لب بھنچ گئے۔ وہ کتنی ہی دیر صدماتی نظروں سے انہیں دیکھے گئے۔

''او وہ میں بھی تھی کہ بابا آخر اب میرا خیال کرنے لگے ہیں مگر وہ سب..... وہ وعدہ وہ فارس کے متعلق ہر بات..... وہ سب آپ اپنے مفاد میں کر رہے تھے۔ آپ مجھے استعمال کر رہے تھے اور فارس کو بھی استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ آپ صرف اسے میرا باڈی گارڈ بنانا چاہتے ہیں۔ ہے نا؟''

''آبدار!'' وہ قمیض جھاڑتے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چہرے پہ سنجیدگی تھی۔ ''ہاشم سے تمہاری جان صرف تب چھوٹے گی جب وہ اپنے خاندان سمیت نیست و نابود ہو گا۔ اسکے لیے تمہیں وہ سب کرنا ہو گا جو میں کہوں گا۔ اب فیصلہ تمہارا ہے۔''

''آپ کو اندازہ ہے کہ ہاشم کے ساتھ اتنا خطرناک کھیل شروع کر کے آپ مجھے کتنے بڑے خطرے میں ڈال رہے ہیں؟'' اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

''اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے انسان کو قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ تمہیں بھی دینی ہو گی۔ جیسے زمر صاحب دیں گی۔'' آخری الفاظ زیرِ لب کہے تھے اور پھر وہ مڑے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے۔ آبدار کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہم کو اس عہد میں تعمیر کا سودا ہے جہاں
لوگ معمار کو چن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ

آتے تھے۔ رات تاریک ہو چکی تھی۔ آسمان پہ تارے جگمگا رہے تھے۔ ایسے میں ایک لمبی سی لش پش چمکتی بی ایم ڈبلیو ایک کھلے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ پورچ میں آ کر رو کر ڈرائیونگ ڈور کھلا اور سفاری سوٹ میں ملبوس منظور جیلانی باہر آتا دکھائی دیا۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے وہاں کھڑے گارڈز کو واپس جانے کا کہا اور تیز تیز چلتا لان چیئرز کی طرف آیا جہاں کوئی اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''میں معذرت چاہتا ہوں غازی صاحب' مجھے دیر ہو گئی اور آپ کو انتظار کی زحمت سے گزرنا پڑا۔'' خوش خلقی سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو وہاں کھڑے فارس نے مسکرا کر گرم جوشی سے ہاتھ تھاما۔ جیلانی نے ایک نظر میز پہ رکھے دو بریف کیسز کو دیکھا اور پھر کرسی کھینچ کر بیٹھا۔ فارس بھی اپنی کرسی پہ واپس بیٹھا۔ وہ سردی میں کمی کے باعث جینز کے اوپر سیاہ ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ چہرے پہ ہلکی مسکراہٹ تھی اور سنہری گہری آنکھیں جیلانی پہ جمی تھیں۔

''میں معذرت کرنا چاہتا تھا۔ میرا بھانجا' بہت جلد باز اور جذباتی ہے۔ ان معاملات کے رموز نہیں سمجھتا۔'' کان کی لو مسلتے ہوئے اس نے معذرت خواہانہ انداز میں بات شروع کی۔ منظور جیلانی نے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں ہاتھ جھلایا۔

''ہم سب اس عمر میں ایسے تھے۔ مگر جب انسان کی عمر بڑھتی ہے تو ترجیحات اور کام کرنے کے طریقے بدل جاتے ہیں خیر آپ مطلوبہ رقم لے آئے۔''

''میں لے آیا ہوں مگر چاہتا ہوں کہ آپ سعدی یوسف کو بات نہ بتائیں۔ اس کو یوں کال کریں گویا ہم یہاں ملے ہی نہیں تھے اور اس سے معذرت کر کے تھوڑا بہلا کر اسے انٹرویو کے لئے بلائیں۔ اس کو اعتماد دیں کہ یہ انٹرویو صرف اس کی سچائی کو دنیا کے سامنے لانے کے لئے کیا جا رہا ہے۔''

''اس کی آپ فکر نہ کریں۔ کوئی چائے پانی دیا بھی آپ کو۔'' وہ فون نکالتے ہوئے بولا تو فارس نے اسی طرح ٹیک لگائے بیٹھے ہاتھ اٹھا کر منع کیا۔

''آپ ان کو گن لیں اور انٹرویو ٹائم کنفرم کر دیں تو میں گھر جاتا ہوں۔''

''چلیں ٹھیک ہے۔ کوئی کمی بیشی ہوئی تو میرا پی اے صبح آپ کو فون کر کے....'' بریف کیس کھولتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا اور پھر یکا یک اس کے الفاظ لبوں پہ ٹوٹ گئے۔ ہاتھ ٹھہر گئے۔ اس نے ڈھکن پورا کھولا اور پھر چونک کر فارس کو دیکھا۔

وہ اسی طرح ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

''یہ کیا ہے؟ اور پیسے کہاں ہیں؟'' اس نے ڈھکن میز تک الٹ دیا تو بریف کیس کا اندرونی حصہ روشنی میں واضح ہوا۔ اس میں کئی درجن سی ڈیز رکھی تھیں جو سفید پلاسٹک کور میں مقید تھیں۔

''پیسے تو خیر میرا باپ بھی نہیں دے گا۔ اور گارڈز کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سعدی یوسف نہیں ہوں۔ دو دفعہ قتل کے جرم میں جیل جا چکا ہوں [illegible]

کرے گا؟"

اسکر نے بریف کیس ہاتھ مار کر نیچے گرایا اور غصے سے اس کو دیکھا۔ "یہ دھمکیاں مجھ جیسے آدمی کو نہیں ڈراتیں۔ اگر میرا مزید وقت ضائع نہیں کرنا تو تم جا سکتے ہو۔" اور ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ نتھنے پھلائے وہ غصے سے فارس کو دیکھ رہا تھا۔

"جیلانی صاحب!" فارس بھی پورے قد سے اٹھا اور جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کو بہت سکون سے دیکھا۔ "اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو ایسے نہ کرتا۔ ذرا تحمل سے ٹھہر کر پوچھتا ضرور کہ ان سی ڈیز میں کیا ہے۔ اور جانتے ہو ان میں کیا ہے؟"

کہنے کے ساتھ اس نے جیب سے ایک پین نکال کر میز پر رکھا۔ سعدی کا پین کیمرہ۔

"مجھے معلوم تھا تم سعدی کو پیسے مانگنے بلا رہے ہو تو میں نے سوچا ان لمحات کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ سو تمہاری اور سعدی کی گفتگو کی ویڈیو HD کوالٹی میں محفوظ کر لی میں نے۔ صرف یہی نہیں، تمہارے آفس میں جو تمہاری وال فوٹو لگی ہے، وہی جس میں امریکہ میں تم کوئی ایوارڈ لیتے دکھائی دے رہے ہو، اس کے اوپر ننھا وال اسکر چپکا ہے، جو تمہارے آفس کی live فیڈ مجھے دیتا ہے۔ اس بریف کیس میں بہت سے لوگوں کے ساتھ تم گفتگو کرتے دکھائی دے رہے ہو۔ کسی کے ساتھ فون پہ، کسی کے ساتھ آمنے سامنے۔ تمہاری کلین سویپ ٹیم جو ہر جمعرات کو تمہارا آفس ڈی بگ کرتی ہے، ان کے آلات بہت پرانے ہیں، وہ میرے وال اسکرز کو نہیں پکڑ سکتے۔"

منظور جیلانی کے چہرے کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ سینے وہ چونکا تھا پھر تحیر ہوا پھر بے یقین اور آخر میں... اس کی رنگت سفید پڑنے لگی تھی۔

"یہ مختلف قابلِ ذکر واقعات کی سی ڈیز ہیں جن میں تم صاف دکھائی دیتے ہو۔ اب میرے پاس دو راستے ہیں، پہلا میں تمہیں یہ سب دے دوں۔ اور تم سعدی یوسف کے اوپر ہفتے کے پانچ دن پانچ شوز کرو۔ نتیجہ، سعدی کی کہانی پورا ملک سن لے گا۔" وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا اس کی آنکھوں پہ اپنی آنکھیں جمائے، چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔ "دوسرا راستہ یہ ہے کہ میں تمہارے مخالف چینل کو یہ tapes دے دوں۔ سب سے زیادہ اہم ٹیپ سعدی یوسف کی ہے، اس ملاقات میں سعدی نے اپنے اوپر ہونے والی زیادتیوں کی مختصر تفصیل بتائی تھی تمہیں۔ دوسری اہم ٹیپ امریکہ میں قید پاکستانی نیورو سرجن لڑکی کی بہن کی ہے۔ جس سے تم فون پہ پچاس لاکھ مانگ رہے ہو ورنہ اس کی بہن کی رہائی کے لیے شو نہیں کرو گے۔ جب یہ ویڈیوز بار بار میڈیا پہ چلائی جائیں گی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ سعدی یوسف کی کہانی پوری دنیا جان لے گی۔ بنا پیسوں کے گھنٹوں کا ائیر ٹائم ملے گا اس کو۔ چاہوں تو میں یہ کر لوں مگر تمہارے گھر والوں نے چائے پلائی ہے مجھے اب مجھے اچھا نہیں لگ رہا کہ تمہارا دل توڑوں اس لیے...." وہ ایک دم آگے بڑھا اور جیلانی کو گریبان سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور بدلے ہوئے لہجے میں غرایا۔ "تم کل صبح سعدی کو فون کرو گے، اس کو عزت سے بلاؤ گے، اس سے معافی مانگو گے اور اس کا شو اتنا اچھے سے کرو گے کہ تمہارے ٹوئیٹر کے تیس لاکھ فالورز کو اس کا نام اور اس کی کہانی ازبر ہو جائے۔ ورنہ میں.... تمہاری... زندگی.... برباد کر دوں گا، کیونکہ تم جیسے لوگوں کے لیے

[illegible]

جانے کے لئے آگے بڑھ گیا۔ دو قدم اٹھائے پھر مڑا اور پوری قوت سے اس کے جبڑے پہ مکا رسید کیا۔ جیلانی لڑکھڑا کر پیچھے کو گرنے لگا مگر کرسی کو تھام لیا۔ اس کا ہاتھ اپنے منہ پہ تھا جس سے خون بھل بھل بہنے لگا تھا۔ تلملاتا ہوا چہرہ اٹھا کر اس نے دبے دبے غصے سے فارس کو دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔

فارس اپنی مٹھی کو چہرے کے قریب لے کر گیا اس میں پھونکا اور پھر کالر جھٹکتے جانے کے لئے مڑ گیا۔

اینکر اپنا زخمی چہرہ لئے دہرا ہوئے کھڑا اس کھلے بریف کیس کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دل کے دریا کو کسی روز اتر جانا ہے

اتنا بے سمت نہ چل لوٹ کے گھر جانا ہے

اس تاریک رات زمر اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ اسٹڈی ٹیبل پہ لیپ ٹاپ کھلا رکھا تھا اور ساتھ میں سیاہ مخملیں ڈبی بھی کھلی پڑی تھی۔ وہ گھنگریالے بال جوڑے میں لپیٹے کہنیاں میز پہ رکھے ہتھیلیوں میں چہرہ گرائے یاسیت سے ہیرے کی لونگ کو دیکھ رہی تھی۔ چناؤ اس کے سامنے تھا مگر فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

اس نے پھر سر جھٹکا اور لیپ ٹاپ اسکرین کی طرف متوجہ ہوئی۔ آن لائن ترجمہ کھلا رکھا تھا سامنے۔ آج دل اتنا بکھرا بکھرا بے کیف تھا کہ وہ کچھ لکھ ہی نہیں پا رہی تھی۔ پھر اس نے توجہ اور دھیان کو اسکرین کی جانب مبذول کرنا چاہا۔

''میں اللہ کی پناہ چاہتی ہوں شیطان مردود سے،

اللہ کے نام کے ساتھ جو بہت مہربان، بار بار رحم کرنے والا ہے۔''

''بھلا کون ہے جو تمہیں جنگل اور دریا کے اندھیروں میں راستہ بتاتا ہے اور اپنی رحمت سے پہلے کون خوشخبری کی ہوائیں چلاتا ہے کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے اللہ ان کے شرک کرنے سے بہت بلند ہے۔

بھلا کون ہے جو از سر نو خلقت کو پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ بنائے گا اور کون ہے وہ جو تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی معبود ہے کہہ دے اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو۔

کہہ دے اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی بھی غیب کی بات نہیں جانتا اور انہیں اس کی بھی خبر نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔''

زمر نے کی بورڈ پہ رکھے اپنے زرد ہاتھ دیکھے پھر جھکے چہرے کے ساتھ ٹائپ کرنے لگی۔ ''اس دنیا میں انسان..... ہم انسان بہت سے کاموں کے لئے بہت سے لوگوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ نوکری کے لئے..... پڑھائی کے لئے..... کورٹ میں کیس چلانے اور انصاف لینے کے لئے.....'' تلخی سے سر جھٹکا۔ ''ہم انسان ''آزاد'' نہیں ہیں۔''

فرماتے ہیں کہ ہمیں اندھے اندھیروں میں جب سمجھ نہیں آرہا ہوتا کہ کیا کریں' کیا فیصلہ لیں' کون سا راستہ اپنا لیں' تب ہمیں راستہ دکھانے والا صرف اللہ ہوتا ہے۔ اور کون ہوتا ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ یہ جو لوگوں کی خوفناک آوازیں اور باتیں ہمیں ڈراتی ہیں نا' ہمیں مستقبل کا خوف دلاتی ہیں' آندھی طوفان جیسی آوازیں اور ہم کان لپیٹ لیتے ہیں' یہ رحمت کی بارش سے پہلے کی ہوائیں ہوتی ہیں۔ یہ بھی اللہ بھیجتا ہے۔ اچھے دنوں کے آغاز سے پہلے شدید بری باتیں سنی پڑتی ہیں' بس ہمارے ضبط کا امتحان ہوتا ہے۔ لوگ نہیں لے رہے' یہ امتحان بھی اللہ لے رہا ہے۔ مگر کیا ہمیں اس پہ اتنا بھروسہ ہے کہ صرف اسی پہ انحصار کر سکیں؟ اور اگر ہم نہیں کرتے صرف اسی پہ توکل' تو اس کو فرق نہیں پڑتا۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کے موازنوں اور مقابلوں سے بہت اوپر' بہت بلند ہے۔ وہ پھر بھی انسانوں کو پیدا کرتا رہے گا' ان کو مارنے کے بعد دوبارہ بھی اٹھائے گا۔ ان کو روزی بھی دے گا۔ ہماری قسمتوں میں کیا لکھا ہے' ہماری شادیاں کب تک چلیں گی' بچے کیسے ہوں گے' بڑے ہو کر کیا ہو گا ان کا' ہمیں موت کس زمین پہ آئے گی' یہ سب ہمیں نہیں پتہ۔ اسے پتہ ہے۔ پھر بھی ہم لوگ اتنے کمزور ہیں کہ صرف اس پہ بھروسہ نہیں کرتے۔ انسانوں کو سہارا بناتے ہیں۔ انسانوں کو سبب بنانا چاہیے' مدد لینی چاہیے' مگر سہارا نہیں بنانا چاہیے۔ ان کے دیے گئے چناؤ کے آپشنز کے آگے ہاتھ باندھ کر مجبور نہیں ہو جانا چاہیے۔" ایک آنسو آنکھ سے ٹوٹا اور گال پہ لڑھکتا گیا۔ وہ جھکے چہرے کے ساتھ ٹائپ کرتی جا رہی تھی۔ "مگر ہم یہ کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ۔ ابھی ایمان اتنا مضبوط نہیں ہوا ہمارا کہ سر پہ کفن باندھ کر نکلیں اور صرف آپ کی مدد کا یقین رکھیں۔ کچھ غلط قدم اٹھانے پڑتے ہیں' ہم بہت کمزور ہیں۔"

"بلکہ آخرت کے معاملے میں تو ان کی سمجھ ہی گزری ہے۔ بلکہ وہ اس سے شک میں ہیں بلکہ وہ اس سے اندھے ہی ہیں۔"

"ہم کیوں خود کو ان لوگوں کا محتاج کر لیتے ہیں جن کو آخرت کا کوئی خوف نہیں ہے۔ انسان کے دل سے آخرت کا خوف نکل جائے' کیسے پتہ چلتا ہے اس کا؟" اس نے رک کر سوچا۔ آنسو سوکھ چکا تھا مگر نشان گال پہ ہنوز موجود تھا۔ "پہلے انسان کی سمجھ بوجھ ختم ہوتی ہے۔ پھر وہ اللہ کی باتیں سمجھنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ وہ دل پہ بوجھ اور دماغ کے لئے کوفت بننے لگتی ہیں۔ پھر شک پیدا ہوتا ہے۔ دل کا آئینہ آلودہ ہو جاتا ہے۔ اور جب انسان وسوسوں کا علاج نہیں کرتا' ان کو جھٹکتا نہیں ہے' اور ان کے مدلل جواب تلاش نہیں کرتا کہ صرف جھٹکنا کافی نہیں ہوتا۔ تو وہ اس شک کا پیچھا کرنے لگ جاتا ہے۔ شک اسے دور اندھیروں میں بھٹکا دیتا ہے' اور وہ اندھا ہو کر بھٹکتا چلا جاتا ہے' بہتا چلا جاتا ہے' اور پھر....." اس نے پچھلی آیت دیکھی' "گویا الٹا چکر کاٹا ہو۔" "اور پھر کون ہے جو انسان کو اندھیروں سے نکال سکتا ہے' راستہ بتا سکتا ہے سوائے اللہ کے؟ او و اللہ' میں کیا کروں؟"

اس نے بازو بچھا کر ان پہ سر رکھ لیا اور آنکھیں بہت کرب سے بند کر لیں۔ سعدی..... یا فارس..... بار بار دو نام ذہن میں ابھرتے تھے۔ چناؤ مشکل تھا۔ ناممکن تھا.... دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو وہ سیدھی ہوئی اور سنجیدگی سے کان کے پیچھے بال اڑستی کی بورڈ پہ انگلیاں چلانے لگی۔ اپنا لکھا گروپ پہ پوسٹ کیا اور دوسری ونڈو کھول لی۔ کنکھیوں سے وہ دیکھ سکتی تھی کہ فارس کمرے میں داخل ہوا تھا۔ آستین کے کف موڑ دو مدھم مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف چلا آیا۔

''آپ خوش ہیں آپ؟ ہو گیا ہیرو کا انٹرویو؟'' وہ اس کے کندھوں پہ جھک کر اس کے کان کے قریب کہہ رہا تھا۔ وہ اس وقت بےزار تھی' بہت بےزار۔ سنجیدگی سے ماتھے پہ بل لئے ٹائپ کرتی رہی۔ بس 'ہوں' کہا۔

''تو پھر کیا کھلائیں گی آپ مجھے؟ ایک بہت اچھا آئس کریم پارلر ہے.....'' وہ پیچھے سے جھک کر کھڑا اس کی کرسی کے دائیں بائیں ہاتھ رکھے' کہہ رہا تھا۔

''جو اس وقت تک کھلا ہوتا ہے۔ آپ کی فیورٹ آئس کریم ملتی ہے وہاں سے۔ چلیں گی۔''

''میں.....کام کر رہی ہوں فارس!'' وہ اسکرین پہ نگاہیں جمائے سنجیدگی سے بولی تھی۔ گویا اسے نظرانداز کیے رکھا۔ مگر اس نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔

''اور اگر آپ چاہیں تو ہم اس کے قریب ایک دوسرے اچھے ریسٹورانٹ میں بھی جا سکتے ہیں' جہاں پہ.....'' اس کے بالوں پہ تھوڑی رکھے وہ اپنی دھن میں کہہ رہا تھا جب زمر نے جھٹکے سے اسکرین نیچے گرائی اور گھومی۔ ''ہم ریسٹورانٹس اور کافی شاپس نہیں جا سکتے فارس۔ کیا تمہیں احساس ہے کہ سعدی کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ بیمار ہو چکا ہے وہ مسخ ہو چکا ہے۔ ہم عدالت میں ایک آئی پی پی کے خلاف کیس لڑنے جا رہے ہیں۔ ہمیں کیس کی تیاری کرنی ہے۔ آئسکریم اور کھانوں کے لئے وقت ہے ہمارے پاس؟'' غم کسی اور کا تھا' نکلا کسی اور پہ تھا۔ دل کسی اور نے توڑا تھا۔ چھپا کسی اور سے لیا تھا۔ وہ سرخ چہرے اور جذبات سے کانپتی آواز سے بولی تھی۔

فارس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ کرسی سے ہاتھ ہٹا کر تیزی سے سیدھا ہوا۔ ایک خاموش مگر برہم نظر اس پہ ڈالی پھر سرعت سے میز پہ رکھی چابیاں اٹھاتا باہر نکل گیا۔ دروازہ دھا سے بند کیا۔

وہ کرسی پہ اکیلی بیٹھی رہ گئی۔ زور سے بند ہوئے دروازے کی کپکپاتی آواز سنتی رہی۔ چند لمحے گہرے سانس لیتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں پانی تھا۔ اور چہرہ جھکا ہوا تھا۔ یکدم اس نے چہرہ اٹھایا۔

جو فیصلہ اتنے دن سے ہو نہیں پا رہا تھا' وہ اس لمحے اس گھڑی ہو گیا تھا۔ چناؤ ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور ننگے پاؤں باہر کو بھاگی۔

وہ پورچ میں کھڑا خفگی سے بڑبڑاتا کار کا لاک کھول رہا تھا۔ اس کے کان سرخ تھے اور ماتھے پہ سلوٹیں پڑی تھیں جب وہ دوڑتی ہوئی بیرونی دروازے کی چوکھٹ تک آئی۔

''آئی ایم سوری۔'' فارس نے ایک سپاٹ نظر اٹھا کر دیکھا اور پھر سر جھکا کر دروازہ کھولنے لگا۔ وہ دوڑ کر آگے آئی اور کار کا دروازہ پکڑ لیا۔ فارس نے رک کر انہی برہم نظروں سے اسے دیکھا۔ اور پھر وہ چونکا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ ''آئی ایم سوری کہ میں نے تمہیں جانے دیا۔ میں کام کر رہی تھی.....کر رہی ہوں.....کیس پہ.....کیونکہ وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو گا اگر ہم یہ کیس نہ جیتے تو۔ آئی ایم سوری کہ میں نے تمہیں جانے دیا۔ مگر میرے پاس اختیار تھا۔ تمہیں جانے دوں یا کیس پہ کام نہ کروں.....'' وہ دروازے کے اوپر دونوں ہاتھ جمائے [illegible]

آنسوؤں کے ساتھ [illegible] فارس [illegible] ماتھے کی سلوٹیں [illegible]

"میرے پاس چوائس تھی۔ تم یا سعدی۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔" تاروں جیسے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی گردن پہ ڈھلک رہے تھے۔ موٹی خوبصورت گھنگریالی لٹوں کے ہالے میں اس کا زرد چہرہ بہت دکھی لگتا تھا۔ فارس کی پیشانی کی شکنیں کم ہوتی گئیں۔

"میں تمہیں نہیں جانے دے سکتی تھی۔ میں سعدی کو بھی واپس لانا چاہتی تھی۔ میں ایک وقت میں ایک کا چناؤ کر سکتی تھی۔" فارس نے ترحم سے اسے دیکھا۔

"زمر تم لوگ خواہ مخواہ اتنا خوار کر رہے ہو خود کو۔ ٹرائل کبھی نہیں چلے گا۔ ایک سال سے پہلے تو شروع نہیں ہوگا۔ ہاشم کبھی کیس نہیں چلنے دے گا۔" مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔

"میرے پاس چناؤ کا اختیار تھا۔ مگر فارس... میں تمہیں نہیں چنوں گی۔" وہ نفی میں سر ہلا کر کہہ رہی تھی۔ اس کی بھیگی آنکھیں زخمی تھیں۔ "کیونکہ تم میرے ہو۔ جو میرا ہے وہ میرا رہے گا۔ میں تمہیں نہیں چنوں گی کیونکہ کوئی بھی تمہیں مجھ سے دور نہیں کر سکتا۔"

اس کے چہرے کی آخری شکن بھی جاتی رہی۔ گہری سانس لے کر وہ اسے دیکھے گیا۔ "تو کون تمہیں مجھ سے دور کر رہا ہے سوائے تمہارے اپنے؟"

"اور میں سعدی کو بھی نہیں چن رہی۔" وہ اسی طرح روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میں کیوں چنوں اس کو؟ میں مجبور نہیں ہوں۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ میں کسی انسان کے سامنے مجبور نہیں ہوں۔ انسان اندھیروں میں راستہ نہیں دکھا سکتے۔ میں نے اپنا چناؤ کر لیا ہے۔" ہتھیلیوں کی پشت سے گال رگڑتے ہوئے اس نے چند گہرے سانس لے کر خود کو سنبھالنا چاہا۔ آنسو پھر بھی ابل ابل رہے تھے اور ناک اور گال گلابی پڑ رہے تھے۔

"میں فارس کو نہیں چنوں گی۔ میں سعدی کو نہیں چنوں گی۔ میں... زمر کو چنوں گی۔ میں خود کو چنوں گی۔" اٹھی گردن اور مضبوط آواز سے وہ چہرہ صاف کرتے ہوئے بولی تھی۔ "میں وہ کروں گی جو زمر کو کرنا چاہیے۔ ظلم زمر کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ سب اپنی زندگی شروع کر سکتے ہیں سوائے میرے۔ زمر کو انصاف چاہیے۔ یہ صرف سعدی کے لیے نہیں ہے۔ یہ زمر کے لیے بھی ہے۔ مجھے بھی تب تک سکون نہیں ملے گا جب تک میں ان لوگوں کو تباہ ہوتے نہ دیکھ لوں۔ میں... زمر کو چن رہی ہوں۔ اور زمر بہت اچھی اداکارہ ہے۔"

اب کے وہ آنکھیں سکیڑ کر غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "زمر اگر کوئی بات ہے تو تم مجھے بتاؤ۔ ایک دفعہ پہلے بھی تم روتے ہوئے کمرے میں آئی تھیں، تمہیں دمے کا اٹیک ہوا تھا اور تم درختوں کی باتیں کر رہی تھیں۔" وہ آگے بڑھا اور نرمی سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ "بعد میں عدالت میں تم نے بتایا مجھے کہ اس رات تم نے حقیقت جان لی تھی۔ میں اب نہیں سمجھ پا رہا کہ کیا ہوا ہے مگر کچھ ہوا ضرور ہے۔ مجھے بتاؤ۔" وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ بھیگے چہرے کے ساتھ مسکرا دی اور نفی میں سر ہلا دیا۔

"میرا ڈپریشن، میرا ذہنی دباؤ بہت بڑھ گیا تھا۔ مجھے لگتا تھا میں کیس کی وجہ سے تم سے دور ہو جاؤں گی۔ مگر نہیں...." اب کے وہ دھیما سا [illegible]

نہیں ہے۔ ہم اچھی امید اور اچھی تیاری کے ساتھ بھی یہ کیس لڑ سکتے ہیں۔ اور ..... تم جب کہو گے ہم ڈنر پہ بھی جا سکتے ہیں۔"

وہ ہلکا سا مسکرایا۔ تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ وہ جو لمحے بھر کے لئے وہ ڈر گیا تھا کہ کچھ ہوا ہے' وہ واہمہ بھی ذہن سے جاتا رہا۔ اس نے نرمی سے اسے اپنے قریب کیا' اور اس کا سر اپنے کندھے سے لگا کر چند لمحے تھپکتا رہا۔ اور پھر بہت محبت سے دھیرے سے بولا۔

"آئی ہیٹ یو' چڑیل!"

وہ ایک جھٹکے سے الگ ہوئی۔ بھیگی گلابی آنکھوں میں ایک دم ڈھیر سارا غصہ عود آیا تھا۔ "کیا کہا؟" وہ بے یقین بھی تھی۔

"احمر شفیع نے تمہارا نام چڑیل رکھا تھا۔ قوی اطلاع ہے کہ کچہری میں بہت سے لوگ تمہیں اسی نام سے پکارتے ہیں اور میں ہر نماز میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ ان لوگوں کو نیک اجر عطا کرے۔" وہ کار کا دروازہ کھولتا کہہ رہا تھا' اور زمر نے بہت مشکل سے اپنی ہنسی روکی چہرے پہ خفگی طاری کیے وہ چیخ کر بولی تھی۔

"اگر تمہیں مجھ سے ذرا سی بھی محبت ہوتی تو تم میرے بارے میں ایسی باتیں کرنے والوں کے دانت توڑ دیتے۔"

"آپ کو کس نے کہا کہ مجھے آپ سے محبت ہے؟ میں نے تو آپ کی دولت کے لئے آپ سے شادی کی تھی۔"

"دولت سے یاد آیا' میرے پیسے کہاں ہیں؟ ہاں؟" وہ اندر بیٹھ چکا تھا اور وہ اس کی کھڑکی پہ جھکی ناراضی سے کہہ رہی تھی۔

"جن پیسوں کو ہاشم کاردار ریکور نہیں کر سکا' آپ نے سوچا بھی کیسے کہ وہ آپ کو مل جائیں گے۔ جائیے زمر بی بی' جوتے پہن کر آئیں' پھر میں آپ کو ڈنر پہ لے کر جاؤں گا۔"

"ہاں' وہ بھی میرے پیسوں سے ہو گا۔" وہ سیدھی ہوتے ہوئے خفا خفا سی بولی اور مڑ گئی۔ پیچھے سے اس نے اس کی بڑبڑاہٹ سنی تھی۔

"لالچی وکیل نہ ہو تو۔" اس دفعہ اصلی والا غصہ چڑھا مگر سر جھٹکتی اندر چلی گئی۔ اس کا ٹوٹا دل بالآخر جڑنے لگا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

خوابوں کے چاند ڈھل گئے تاروں کے دم نکل گئے

پھولوں کے ہاتھ جل گئے' کیسے یہ آفتاب تھے!

وہ صبح پگھلے سونے کی سی حدت لئے ہوئے طلوع ہوئی تھی۔ سورج کی ترچھی کرنیں قصرِ کاردار کے ستونوں سے ٹکرا کر پلٹ رہی تھیں۔ اندر اونچی کھڑکیوں سے چھن کر آتی روشنی نے ڈائننگ ہال کو منور کر رکھا تھا۔ سربراہی کرسی پہ ہاشم بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔ نوشیرواں ہنوز کمرے میں بند تھا' اس کا ساتھ دینے کو دائیں ہاتھ جواہرات بیٹھی تھی۔ جانے دونوں کی کرسیوں کی جگہ کب بدلی تھی' مگر جواہرات نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ جانتی تھی کہ اب خاندان کی ڈرائیونگ سیٹ پہ وہ نہیں تھی۔ مگر وہ مطمئن تھی۔ کانٹے میں پھل کا ٹکڑا پھنساتے وہ ہمدردانہ لہجے میں بولی تھی۔

"تم نے نادر سے تعلق ..."

"ہوں!" اس نے سر ہلایا۔ "اس کے بیٹے کا فون آیا تھا۔ میں مالی طور پہ مدد کرتا رہوں گا اس کی فیملی کی۔ کچھ عرصے تک۔"

"تمہارا بڑا ظرف ہے ہاشم!" اس نے جھرجھری لی۔ وہ خاموشی سے کھاتا رہا تو وہ ذرا پینترا بدل کر بولی۔ "مگر جو بھی ہے مجھے بہت افسوس ہوا اس کا سن کر۔"

"اپنے کیے کا پھل ملا ہے۔" اس نے سر جھکا تھا پھر نیپکین رکھتا اٹھ کھڑا ہوا۔ جواہرات نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ آفس کے لئے تیار لگ رہا تھا۔ ٹائی، کف لنکس، سب اپنی جگہ پہ تھے۔ "ٹرائل کا کیا بنے گا؟"

"کوئی ٹرائل نہیں چلے گا ممی۔ ایک ایک پیشی کے لئے ترساؤں گا انہیں۔" موبائل اسکرین پہ انگلی پھیرتے وہ ساتھ سے نکل کر چلا گیا۔

جواہرات نے طمانیت کا گہرا سانس لیا اور مسکرا کر جوس لبوں سے لگالیا۔ خاور کا باب تو ختم ہوا.....

چند میل دور.... اس پر شکوہ عمارت کے ایک وسیع آفس میں ہارون عبید اپنی مخصوص کرسی پہ براجمان تھے۔ ٹیک لگا کر بیٹھے، گال تلے انگلی رکھے وہ محظوظ نظروں سے سامنے بیٹھی زمر کو دیکھ رہے تھے جس کی گردن اٹھی ہوئی تھی اور چبھتی ہوئی نظریں ان پہ جمی تھیں۔ وہ درمیان میں حائل میز کے باعث یہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ زمر نے کرسی کی نشست ایک ہاتھ سے مضبوطی سے تھام رکھی ہے۔ اور بار بار وہ تھوک نگل کر خود کو پرسکون ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تو آپ نے کیا فیصلہ کیا؟"

"اگر آپ واقعی ہاشم کاردار کو ہمارے ساتھ ٹرائل کرنے پہ آمادہ کر لیتے ہیں تو ٹھیک ہے۔" ہلکے سے کندھے اچکا کر خود کو بے نیاز ظاہر کرنا چاہا۔ "میں فارس کو چھوڑ سکتی ہوں۔"

"اچھا۔" وہ ذرا سا مسکرائے۔

"اور میں جانتی ہوں کہ آپ یہ اپنی بیٹی کے لئے نہیں کر رہے۔" اب کہ وہ بھی ذرا سا مسکائی تھی۔ "آپ فارس کو استعمال کرنا چاہتے ہیں، اسے اپنی بیٹی کا باڈی گارڈ بنانا چاہتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہو پائے گا۔ وہ کبھی بھی ایسے کسی دام میں نہیں آئے گا۔ میں نہیں وارن کروں گی اسے۔ مگر وہ خود اتنا سمجھدار ہے کہ آپ کا ہر وار خطا جائے گا۔"

"یہ میرا مسئلہ ہے، اس لئے کیوں نا ہم وہ بات کریں جو آپ کا مسئلہ ہے۔" آگے ہوتے ہتھیلیاں باہم پھنساتے ہوئے انہوں نے مسکرا کر کہا۔ "آپ نے اچھا فیصلہ کیا، اپنے بوجھ کو کسی کی زندگی سے نکال کر اسے ہلکا کرنے کا فیصلہ بہت اچھا رہتا ہے۔ آپ کو اور کچھ نہیں کرنا۔ بس اس کی زندگی سے نکل جانا ہے۔"

"مگر ٹرائل کے بعد۔ ہم ٹرائل جیتیں یا ہاریں، اس وقت کا انتظار نہیں کروں گی میں، مگر کم از کم جب اتنا کیس چل چکا ہوگا کہ مجھے لگے آپ نے اپنا وعدہ ایفا کر دیا ہے تو میں اسے چھوڑ دوں گی۔"

"اور اگر آپ نے [illegible] لیا ہو؟" [illegible]

اچکائے۔

’’جب میں آپ پہ اعتبار کر رہی ہوں تو آپ کو بھی مجھ پہ یقین کرنا چاہیے۔‘‘

’’مگر ہو سکتا ہے کہ یہ صرف آپ کی چال ہو۔ آپ صرف وعدہ کرنے کی اداکاری کر رہی ہوں اور اپنا مطلب نکل آنے کے بعد آپ اپنی بات سے پھر جائیں۔ ایسے میں مجھے تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔‘‘ ان کی زیرک نگاہیں اندر تک اتر رہی تھیں۔ زمر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا مگر چہرے پہ مسکراہٹ برقرار رہی۔

’’ٹھیک ہے۔ آپ نے یقیناً کوئی کانٹریکٹ بنوا رکھا ہوگا۔ لائیے، میں دستخط کر دیتی ہوں۔‘‘

’’آپ وکیل لوگ ہر کانٹریکٹ کے نکلنے کے سوراخ ڈھونڈ لیتے ہیں، میں ایسی غلطی نہیں کروں گا۔‘‘

’’تو پھر آپ میری یہ گفتگو ریکارڈ کر رہے ہوں گے۔ یقیناً تاکہ مجھے بلیک میل کر سکیں۔‘‘

’’ایسا بھی نہیں ہے۔‘‘ انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’کیونکہ آپ بہت محتاط الفاظ کا چناؤ کر رہی ہیں، اگر اس منظر کی ویڈیو بنا کر میں فارس کو دکھا بھی دوں تو آپ وکٹم لگیں گی اور میں ولن۔ یوں فیصلہ آپ کے حق میں ہو جائے گا۔ مگر میں ایسا نہیں چاہتا۔‘‘

پہلی بار زمر کو محسوس ہوا کہ کمرے میں تناؤ اور گھٹن بڑھ گئی ہے۔ خطرے کا سائرن دور کہیں زور زور سے بجنے لگا۔ کوئی آواز مگر سنائی نہیں دیتی تھی صرف سرخ بتی جلتی بجھتی دکھائی دے رہی تھی۔ کچھ نے اندر کہا کہ اٹھو اور بھاگ جاؤ لعنت بھیجو اس پیسے پہ، سعدی کو سمجھا لینا، مگر جس کا اندر زیادہ زور چلتا تھا اس نے اس آواز کو دبا لیا۔ کیونکہ ’’زمر‘‘ کا انتخاب زمر نے کر لیا تھا۔

’’تو پھر کیسی ضمانت چاہیے آپ کو مجھ سے؟‘‘

انہوں نے جواب دینے کی بجائے میز پہ کھڑا کر کے سیدھے رکھے ٹیبلٹ کی طرف توجہ مبذول کی اور اسکرین کو چھو کر کچھ دیکھنے لگے۔

’’جب آپ اس عمارت میں داخل ہوئی تھیں تو آپ نے اپنا پرس ایکس رے سے گزارا تھا۔ آپ کے پرس کے اندر کی تصویر... اندر تک کا خاکہ میرے پاس کھلا رکھا ہے۔ اس میں ایک چھوٹی چوکور شے نظر آ رہی ہے جس کے اندر ایک ننھا سا ہیرا موجود ہے۔ یہ تصویر چونکہ پرس کا ایک رے امیج ہے، یہ صرف ایک خاکہ دے سکتا ہے، مگر میں جانتا ہوں کہ وہ ہیرا اس نوز پن کا ہے جو کسی زمانے میں فارس غازی نے آپ کو دی تھی۔‘‘

کرسی کی نشست پہ جمے اس کے ہاتھ نے زور سے لیدر کو بھینچا۔ اس کے کندھے قدرے سیدھے ہوئے۔ لب پھڑپھڑائے۔ آنکھوں میں استعجاب ابھرا۔

’’اور جب آپ کو یہ معلوم ہوا تھا کہ یہ تحفہ دینے والا فارس تھا تو آپ غصے سے گھر چھوڑ کر جنگل کی طرف نکل گئی تھیں۔ اس دن کے بعد سے آپ نے اس کو نہیں پہنا۔ حیران مت ہوں۔ کچھ تو معلومات ہوں نا میرے پاس بھی!‘‘

[illegible]

زبان کے اتنے ہی کچے ہوتے ہیں۔ خیر آپ اس نوزپن کا ذکر کیوں کر رہے ہیں؟"

وہ بولی تو آواز میں دبا دبا غصہ سا لگتا تھا۔

"اگر یہ آپ کے پرس میں نہ ہوتی تو مجھے خیال بھی نہ آتا' مگر میری قسمت اچھی تھی۔" وہ ٹیبلیٹ نیچے رکھتے ہوئے مسکرا کر بولے۔

"آپ اسے خود ہی میرے پاس لے آئیں۔" پھر باہم مٹھیاں پھنسائے مزید آگے کو ہوئے اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "مسز زمر... اپنی بات پہ اعتبار دلانے کے لئے آپ مجھے اس سے اچھی ضمانت نہیں دے سکتیں۔ اس ڈبی کو میرے پاس چھوڑ جایئے۔"

آسمان کے سارے تارے ایک دم سمندر میں جا گرے تھے۔ اس کا سانس تک رک گیا تھا۔ "یہ ڈبی؟"

"جی۔ جب آپ یہ وعدہ پورا کریں گی تو میں اسے واپس کر دوں گا۔ نہیں کریں گی تو میں.... بلکہ میں کیا کروں گا؟ میری ملکیت میں یہ ڈبی دیکھ کر وہ خود ہی آپ کو چھوڑ دے گا۔ اسی کو ضمانت کہتے ہیں نا۔ اسی کو کانٹریکٹ اور ایگریمنٹ کہتے ہیں نا۔ اور جب آپ نے اسے چھوڑ ہی دینا ہے تو پھر یہ ڈبی کوئی حیثیت تو نہیں رکھتی ہو گی آپ کے لئے۔ سو... اسے.... مجھے.... دے دیں۔"

تارے سمندر کی سطح پہ چند لمحے تیرتے رہے' مگر تنکے جیسا سہارا بھی نہ ملا تو اندر گرتے چلے گئے.... ڈوبتے چلے گئے۔ اس کی بھوری آنکھوں کی جوت بجھ گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہارون منتظر سے اسے دیکھے گئے۔ وہ کچھ نہ بولی۔ چپ چاپ ان کو بجھی بجھی نظروں سے دیکھتی رہی۔ اس کے ذہن میں چند منظر ہو رہے تھے۔ اور دل بند ہونے کو تھا۔

"میں آپ کے ساتھ کسی قسم کی اداکاری نہیں کر رہی۔ لیکن اگر آپ کو صرف اس طرح یقین آتے تو اس طرح سہی۔" پرس سے وہ ڈبی نکال کر اس نے کھول کر میز پہ رکھی۔ اندر جگمگاتا ننھا ہیرا ڈھیر ساری روشنی منعکس کرنے لگا۔

"یہ لیجئے۔ اگر آپ نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا تو میں ہاشم کو بتا دوں گی کہ آپ کی بیٹی میرے شوہر کے لئے کیا جذبات رکھتی ہے اور جب اسے پتہ چلے گا تو وہ اس کا کیا حشر کرے گا' آپ کو معلوم ہے سو اب آپ بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔" وہ سپاٹ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

ہارون واقعی چونکے تھے۔ اس کے الفاظ پہ نہیں اس ڈبی کو دیکھ کر۔ پھر انہوں نے ایک سراہتی نظر زمر پہ ڈالی۔ "گویا وہ امتحان میں پاس ہو گئی تھی۔

"وہ بہت جلد خود آپ سے کہے گا کہ اسے یہ کیس لڑنا ہے' یہ میرا وعدہ ہے۔ اسی میں ہم سب کا فائدہ ہے۔"

زمر نے پرس اٹھایا اور ایک کٹیلی نظر ان پہ ڈال کر باہر نکل گئی۔ دروازہ زوردار آواز سے بند کیا تھا۔

باہر راہداری میں چلتے ہوئے اس نے بدقت ابلتے آنسو روکنے چاہے مگر وہ نہیں رکے۔ قطرے ٹپ ٹپ چہرے پہ لڑھکنے لگے۔ اس نے رک کر دیوار کا سہارا لیا' گویا خود کو ڈھے جانے سے روکا ہو' بچایا ہو۔ کچھ کھو دیا تھا اور اب دل ڈوب ڈوب کر ابھرتا تھا۔ چند گہرے سانس لیے' چند آنسو پیے اور پھر وہ دوبارہ سے چلنے لگی۔ اب کی دفعہ آنکھوں کی جوت بجھ چکی تھی مگر چال ویسی ہی تھی۔ محتاط سی۔ ذرا سی پھسل گئی سکتی ہے اور... [illegible]

چند میل دور ہاشم کے آفس کے باہر کھڑی آبدار نے موبائل پہ آیا پیغام دیکھ کر سے واپس پرس میں ڈالا پھر جی کڑا کر چلتی ہوئی دروازے کے قریب آئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا مگر وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ پرسکون رکھنے کی کوشش کیے ہوئے تھی۔

دروازے کا ہینڈل پکڑتے ہوئے وہ زیر لب بڑبڑائی۔

''اتنا بڑا خطرہ مول لے لوں کیا؟'' پھر سر جھٹکا' اور اداسی سے مسکرائی۔

''وہ... تمہارے لئے... ایسا کبھی نہیں کرے گی فارس!'' اور پھر اندر داخل ہو گئی۔ آفس ابھی خالی تھا اور حلیمہ کے بقول ہاشم کے آنے میں آدھا گھنٹہ تھا۔ آبدار کو اب آدھا گھنٹہ ادھر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

''مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔'' حنین یوسف نے اس صبح اس سے یہ کہا تو جواب میں فارس نے سر ہلا کر کہا تھا۔

''مجھے بھی تمہیں کچھ بتانا ہے۔'' وہ دونوں مور چال کے پورچ میں کھڑے تھے اور وہ باہر جانے کی تیاری میں تھا۔

''میں جانتی ہوں آپ کو خاور کے بارے میں بتانا ہے۔ میں بھی وہی بتانا چاہ رہی ہوں۔'' وہ چمکتی آنکھوں اور معصوم مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔ ''اس کا ایک بیٹا ہے۔ جواب واپس اپنی ماں اور دادی سمیت خاور کے گھر آکے رہنے لگ گیا ہے۔ میں نے اس کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس کے باپ نے کیا کیا اور کن کے لئے یہ سب کیا۔ اس کا دل بدل گیا ہے اپنے باپ کے لئے اور کسی شخص کے لئے اس سے بڑی سزا کیا ہو گی کہ اس کی اولاد کا دل بدل جائے اس کے لئے۔ میرا خیال ہے آپ کو....'' وہ جوش سے تیز تیز بول رہی تھی۔

قریباً گھنٹے بھر بعد وہ اس بنگلے کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ جینز اور شرٹ میں ملبوس وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے سنجیدگی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ عجیب خاموشی کمرے میں حائل تھی۔ سامنے بیٹھا نوعمر لڑکا خاموش تھا۔ وہ الجھا ہوا بھی تھا۔ مگر مقدس خاموشی کو توڑ نہیں پا رہا تھا۔

دفعتاً چوکھٹ پہ آہٹ سی ہوئی۔ وہ دونوں اس طرف دیکھنے لگے۔

ایک عورت پہلے نمودار ہوئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ ایک وہیل چیئر کی پشت کو تھامے ہوئے تھے جس کو دھکیلتی ہوئی وہ اندر لا رہی تھی۔

فارس کی نظریں وہیں جم گئیں۔ وہ بس اسے دیکھتا رہا۔

وہ خاور تھا۔

اس کا اکڑا ہوا فالج زدہ جسم وہیل چیئر پہ رکھا تھا۔ گویا اس میں روح نہ ہو۔ گردن ترچھی منجمد سی تھی اور چہرے پہ آکسیجن ماسک چڑھا تھا۔ ساتھ چند نالیاں بھی جڑی تھیں۔ اس کے ہونٹ ٹیڑھے میڑھے سے ہو کر ایک زاویے پہ جم گئے تھے اور آنکھیں... صرف وہی حرکت کرتی تھیں۔ ان کی سیاہ گیندیں گھوم گھوم کر فارس کے چہرے سے ٹکراتی تھیں۔ ان میں بے بسی تھی' خوف تھا' دکھ تھا۔

''کیا ان کی بہتری کی کوئی امید ہے؟'' اس نے سادگی سے لڑکے کو مخاطب کیا۔ لڑکے نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا۔

''ان کا جسم مستقل طور پر مفلوج ہو چکا ہے۔ ہاتھوں میں صرف ایک انگلی ہلا سکتے ہیں ایک دفعہ ہاں... [illegible]

بول بھی نہیں سکتے۔ بس دیکھ سکتے ہیں۔ روتے بہت ہیں۔ آواز دل سے۔ مگر الفاظ نہیں نکلتے۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ فالج ایک ہے اور ایسی صورتحال میں ہمیں اب سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔'' وہ دبی آواز میں بتا رہا تھا۔

فارس بس گردن موڑے اسے دیکھتا رہا۔ جو سمٹا سمٹا سا وہیل چیئر پہ پڑا تھا۔ زرد بے جان چہرہ' بے حد گرا ہوا وزن' ہڈیوں کا ڈھانچہ سا انسان۔ اس کی بھیگی نظریں فارس پہ جمی تھیں۔ بہت سے ماہ و سال دونوں کے درمیان فلم کی طرح چلنے لگے تھے۔

''بول نہیں سکتے تو کیا ہوا۔ سن تو سکتے ہیں نا۔'' وہ بہت دیر بعد بولا تھا اور آواز ٹھنڈی تھی۔ ٹھنڈی اور سپاٹ۔

''جی' سن سکتے ہیں۔'' لڑکے نے سر ہلا دیا۔

''تو پھر آج کرنل خاور تمہارے ساتھ کچھ سنیں گے۔ ایک کہانی جو میں سنانے جا رہا ہوں۔'' فارس نے نگاہوں کا رخ اس لڑکے کی طرف پھیرا۔ ''اور میں چاہتا ہوں کہ تم اس کہانی کو ساری زندگی یاد رکھو' جب تک یہ زندہ ہیں تم روز ان کو وہ کہانی سنایا کرو۔'' خاور کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

''میں سمجھا نہیں۔'' لڑکا اب کے الجھا تھا۔

''جب میں شروع کروں گا تو سمجھ جاؤ گے۔ پھر بتاؤ شروع کروں؟'' اس نے اسی سکون اور اطمینان سے پوچھا تھا۔ لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا۔ خاور نے بہت کوشش کی کہ وہ چیخے چلائے' گردن ادھر ادھر مارے' اس کی منت کرے' اسے روکے' روئے پیٹے' اس کے قدموں میں گر جائے اور اسے منع کرے۔ میرے بیٹے کو مت بتاؤ۔ خدارا مت بتاؤ۔

مگر اب..... اختیار اس کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔

اور اگر تمہیں کبھی کوئی کہے کہ انسان کے کیے گئے ظلم گھوم پھر کے اس کے پاس ایک دن ضرور لوٹتے ہیں تو یقین کر لینا کیونکہ ایسا ضرور ہوتا ہے۔

ادھر حسین مور چال کے لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھتے ہوئے ڈرائے فروٹ کھا رہی تھی۔ زمر ابھی ابھی لوٹی تھی اور خاموش سی ادھر بیٹھی تھی' گویا ذہن کہیں دور الجھا ہو۔ سعدی لیپ ٹاپ لئے بیٹھا کچھ پوائنٹس کاغذ پہ لکھ رہا تھا۔ وہ انٹرویو کی تیاری کر رہا تھا۔

دفعتاً حسین اٹھی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ مٹھی میں خشک میوے بھرے' وہ ان کو وقفے وقفے سے کھاتی' زینے چڑھتی اوپر آئی۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور پھر.....

اس کی دلخراش چیخ سب نے سنی تھی۔ زمر اور سعدی کے خیالات ٹوٹے' جیسے ان کو ہوش آیا۔ وہ دونوں اوپر کی طرف بھاگے۔

''حسین کیا.....'' چوکھٹ تک آتے ہوئے سعدی کے الفاظ ٹوٹ گئے۔ کمرے کی حالت بتا رہی تھی کہ کیا ہوا تھا۔

ہر شے بکھری ہوئی تھی۔ الماریاں دراز کھلے پڑے تھے۔ جوتوں والے خانے سے سارے ڈبے نکلے ہوئے تھے۔ لاک والی دراز میں چابی لگی [illegible] کھڑکی [illegible] کھلی تھی [illegible]

"تم ٹھیک ہو؟ کیا ہوا؟" زمر نے بے اختیار اسے کندھوں سے تھاما اور اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔

"وہ میرے سامنے کھڑکی سے کودا... اور..." وہ شل سی ابھی تک گردن موڑے باہر دیکھ رہی تھی۔ "اور اس نے دیوار پھاند لی۔"

"کون؟ کون تھا؟" سعدی تیزی سے بالکونی میں بھاگا تھا۔

"وہ ایک آدمی تھا اس نے سرخ مفلر لپیٹ رکھا تھا اور... اور اس کے لمبے بال تھے... اور چھوٹا سا قد تھا۔" وہ سفید چہرے کے ساتھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بتانے لگی۔ سعدی واپس اندر آیا اور سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ اسے نیچے جا کر اس آدمی کو پکڑنا تھا۔

"کیا کر رہا تھا وہ یہاں؟ بتاؤ حنین؟"

"اس کے ہاتھ میں میرا میموری کارڈ تھا۔ وہ علیشا والا میموری کارڈ لے کر چلا گیا۔ اللہ میرے!" حنین نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ زمر نے بے ساختہ کھلی دراز کو دیکھا۔ اسے زور کا چکر آیا تھا۔

"میرے پاس تو اسکی کاپی بھی نہیں ہے زمر۔ اب کیا ہو گا؟"

زمر نڈھال سی کاؤچ پہ گر سی گئی۔ اب کیا ہو گا؟

قصر کاردار کے برآمدے کے اونچے ستونوں پہ دھوپ کی پیلی کرنیں گرتی نظر آ رہی تھیں۔ ہاشم موبائل دیکھتا زینے اترتا نیچے آ رہا تھا۔ اس کی کار سامنے منتظر سی کھڑی تھی۔ ڈرائیور دروازہ کھولے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ وہ ابھی کار کے قریب آیا کہ ایک گارڈ سامنے سے تیز تیز چلتا اس طرف آتا دکھائی دیا۔

"سر!" اس نے عجلت میں پکارا۔ ہاشم نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کیا ہے؟"

"ایک ملاقاتی ہے آپ کے لئے۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ ان سے واقف ہیں، سو ان سے مل لیں؟"

"اسی وقت؟" اس نے نخوت سے ابرو اٹھائی مگر پھر وہ ٹھہر گیا۔ گارڈ کے پیچھے آتے ذی نفس کو وہ پہچان گیا تھا۔ پاسپورٹ، انجان کالز، بہت سی کڑیاں ایک ساتھ ذہن میں مل گئیں۔

"ہیلو مسٹر کاردار!" وہ قدم بقدم چلتی ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور اپنے ہیروں کی انگوٹھیوں سے مزین ہاتھ سے کان کے پیچھے بال اڑستی نرمی سے بولی۔ "میں یہ جانے بغیر کہ کس کے لئے کام کر رہی ہوں، آپ کے لئے بہت کچھ کر چکی ہوں پہلے۔ اب بھی فارس غازی کے خلاف آپ کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"آپ کی تعریف؟" وہ انجان بن کر بولا البتہ چہرے کی تمام بےزاری اور کلفت غائب ہو چکی تھی۔ مسکرا کر، دلچسپی سے وہ اس نوارد کو دیکھ رہا تھا۔

[illegible]

Join Us on Facebook

Get Notificatons of Newly Uploaded Books

Find us on:
facebook®

Follow below Image to Get Notifications of Newly Uploaded Books



ہاشم کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ ''تو وہ آپ تھیں۔ سعدی یوسف کا پاسپورٹ چرانے والی۔ اور یقیناً پاسپورٹ کے علاوہ بھی بہت کچھ ہو گا آپ کے پاس۔'' مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتا وہ کہہ رہا تھا۔

''وہ آپ تھیں! بہنا!''

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)